

26

داستانِ کر بلا

حادثہ کر بلا پر مشاہیر علما اور
ممتاز اہل قلم کے بصیرت افروز
مقالات کا مجموعہ !

مترجم

محمد عبدالرحمن سعید صدیقی

تفسیر اکیڈمی

بلاس اسٹریٹ۔ کراچی (پاکستان)

قیمت - تین روپے

جنگ حقوق و انٹی بھرت چودھری محمد قبال سلیم گاندھی

مالک نقیب اکیڈمی کراچی

محفوظ ہیں

۶۲۴۴

اپریل ۱۹۴۵

طبع اول

ستمبر ۱۹۴۶ء

طبع دوم

اکتوبر ۱۹۵۱ء

طبع سوم

کتبہ محمد سلیم نوشندیس

مکتبہ عوامی ادبی پبلیشر کراچی

فہرست

صفحہ

۱

سید صدیق نقوی

مقدمہ

۲۹

مولانا ابوالکلام آزاد

داستان کربلا

۱۰۶

۴ " "

حادثہ کربلا

۱۱۳

۴ " "

اسوۃ حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین خان

ذکر حسینؑ

مولانا سید طراحت گیلانی

شہادتِ حسنیٰ

قائد ملت نواب بہار جنگِ خم

شہادتِ کبریٰ

مولانا ابوالکلام آزاد

پاؤں حسین علیہ السلام

اے کر بلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپتی ہے سچتہ پہ لاش جگر گوشہ رسول
اسلام کے اہل سے تری پیاس کچھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسول !
کرتی ہے گی پیش شہادتِ رسول کی
آزاد مئی حیات کا یہ سرمدی اصول

و مولانا فاضل علی خان



مقدمہ

کون و سناو کے اس قدیم عالم میں مظلومی حق کی مثالیں
 نہیں ہیں۔ خاکدانِ ارضی کے آثارِ اقوام و ملل کی حیات کے
 روز اور تاریخ کے اورانی ان شواہد سے بھرے پڑے ہیں
 و خلیل کی بت شکنی کا جواب آتشِ نرود و حضرت یوسف کی
 منی کا صلہ زندانِ مصر حضرت زکریا کے اعلانِ حق کا نتیجہ آپ
 ہ کشی حضرت عیسیٰ کے وعظ کی تلقین کا بدلہ رومی صلیب اور
 یسے کی دعوتِ الی اللہ کے مقابلہ میں ترمسین و ترعیب اور
 و آلام کی بے پناہ آزمائشیں !

ایثارِ فدویت کے ان ہی واقعات میں کر بلا کے حادثہ منظم کو بھی
 یہ مقام حاصل ہے۔ یہ مظلومی حق کی ایسی وردانگیز مثال ہے
 کہ گزشتہ تیرہ صدیوں سے آسروں کے کتبہ سیلاب
 لوگوں سے رواں ہو چکے ہیں۔

تہ شہیر علیہ السلام کے منہرات پر عزا داری اور راجہ

میں مجاہدانہ جان نثاری کے نقاط نظر سے بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ آپ کی منگولوی اور بے بسی کا بلا اتنی بڑا فرقہ و ملت پر دوست و دشمن کو اعتراض ہے۔ لیکن اسرار شہادت سے متعلق جہاں اہل نظر کی بصیرت افزا روش گائیاں ہیں۔ وہیں عقلیت "ورلڈلزم" کے پرستاروں نے کر بلا کی معرکہ آرائی پر منطقیانہ رد و قہر بھی کیا ہے چونکہ شیئر فوڈ کے مسئلہ پر ^{کچھ} تاریخی نقطہ نظر سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اگر محسوس کی بھی گئی تو بعض مخاطب بزرگوں نے اس ٹیل و قال سے عمداً اجتناب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس گروہ نے واقعہ شہادت کے اسرار و غوامض کو تھکان اہل بیعت کے ساتھ شخص عقیدہ بندی پر محمول کیا۔ انکار بیعت کو جماعت بندی سے تعبیر کیا گیا۔ کوفہ کی روانگی کو حصول خلافت کی آرزو اور کر بلا کی معرکہ آرائی کو ظالم بدہن، دو حریفوں کے اغراض و مقاصد ذاتی کا تصادم خیال کیا گیا۔ غرض ان معترضین نے اپنے نکتہ نگاہ میں غلو کے باعث منطقی استدلال کے میدان میں وہ قلابازیاں کھائی ہیں کہ ان کے ہاتھ سے حق شناسی کا دامن چھوٹ گیا۔ اور اندیشہ ہے کہ غیر معتدل تصورات کی یہ روئی پود کے اذہان کو مسموم کرے۔ وقت کا اقتضار ہے کہ تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ پر تمام اعتراضات کی منہ بچ کی جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ فرزند رسول علیہ السلام ہی کا اسوہ مسلمانوں کیلئے سرایہ اتباع و تقلید۔ واقعہ شہادت کے سلسلہ میں عموماً حسب ذیل اعتراضات

لئے جاتے ہیں۔

۱۱، حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے کیوں انکار کیا؟ کیا انکار اپنے دعویٰ خلافت کو منوانے کا اقدام نہ تھا؟
 ۱۲، اگر انکار بیعت توریث کے خلاف احتجاج تھا۔ تو حضرت علیؑ یا حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد حضرت امام کا سچے آپ کو حقدار خلافت تصور کرنا کیا بجائے خود توریث کی ترویج کے مترادف تھا؟

۱۳، حضرت امام کو اگر قرآن اور سنت کی روشنی میں ایک دولت فلاح منظور تھی۔ تو کیا انکار بیعت سے تفریق دولت کے بغیر تفسیر نہ بنتا اور راست پر لانے کی کوشش نہیں کی جاسکتی تھی؟ انکار بیعت نے حضرت امام اور یزید میں عداوت کی آہنی دیوار کھڑی کر دی۔ بالآخر کربلا کے غمخیز سرگم پر منتج ہوئی۔

۱۴، یزید کے متابلیہ میں سرگم آرائی حضرت امام کے نقطہ نظر سے فی الحقیقت جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ تو وہ وقوع جنگ سے قبل حضرت نے یہ تین شرطیں کیوں پیش کیں؟

(الف) جہاں سے آیا ہوں مجھے وہیں لوٹ جانا ہے۔

(ب) مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینا ہے۔

(ج) مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو وہاں کے

لوگوں پر جو گزرتی ہے۔ وہ مجھ پر بھی گزریں گی۔

(۶) اس عہد میں عربی معاشرہ کا رنگ عجمی ہو چکا تھا۔ قبائل کی باہمی رقابتیں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ اگر نبی امیہ کا فرد نہ ہوتا۔ تو کیا قومی عصبیت کا انتشار، باہمی افتراق و نزاع کا سیلاب اسلامی حکومت کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوتا۔

چونکہ ان مسائل کا بنیادی تعلق خلافت سے ہے۔ اس لئے سب سے پہلے تصور خلافت کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی نظریہ سیاسی کا مرکز و محور اس کی روح اور اس کا جوہر یہ عقیدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کا اختیار خدا کے سوا کسی فرد بشر کو حاصل نہیں۔ کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے

۱۰۱ الحکم الا للہ امر الہ
تقیدوا الا ایاکذا ذالک الدین
القیس

حکم سولے اللہ کے کسی اور کا نہیں
اس کا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی
نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

اس سے منطقی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب حاکمیت صرف خدا کے واحد کے لئے مخصوص ہے۔ اور قانون ساز بھی صرف اسی کی ذات ہے۔ تو کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ذات خود حکم دینے یا منع کرنے کا مجاز نہیں۔ البتہ اللہ کی زمین پر جو کوئی حکمراں ہو۔ اسلامی دستور کے مطابق لا مجال وہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ تصور کیا جائیگا

صرف مفوضہ اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔

اس پاک اور بے لوث عقیدہ کو لے کر اسلام دنیا میں آیا۔ تو وہ
 بچے وقت کی سب سے بڑی انقلابی قوت تھا۔ اس وقت کی بدولت
 صالح عناصر کی ترکیب و امتزاج سے ایک زبردست اُمت کو قوام حیات
 نیا رہا ہوا۔ پھر اسوۂ نبوت کے اثر سے غیر متزلزل تقویٰ و کردار کے
 سرسامان نے اسلامی تحریک میں دفاع حق اور انجذاب حق کی قوتیں
 جمع کر دی تھیں۔ اور ان ہی کی دو قوتوں کے باہمی اتحاد کا نام دراصل
 خلافت ہے۔ اللہ نے خلافت کا وعدہ چونکہ تمام مومنوں سے کیا ہے
 اس لئے ہر مومن خلافت کا حامل ہے۔ اسلامی معاشرہ میں طبقات
 کی تقسیم اور معاشی یا معاشرتی امتیازات کو دخل نہیں ہے۔ اس میں افراد مساوی
 الخیث اور مساوی المرتبہ ہوتے ہیں۔ البتہ فضیلت کا مدار علم صحیح اور
 عمل صالح۔ شخصی قابلیت اور اعلیٰ سیرت پر ہوا کرتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتکم
 خلافت کے معنی جانشینی یا قائم مقامی کے ہیں۔ لیکن منہ خلافت پر صرف
 متمکن ہو جانے سے جانشینی کے مقصد کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ جانشینی بابر
 عہدہ۔ باعتبار منصب، باعتبار فرائض۔ باعتبار اخلاق و اعمال اور باعتبار
 مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔ خلیفہ حقیقی وہی ہے جو اپنے پیش رو کے
 کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ حامل ہو۔

حضرت اکرم صلعم کو دنیوی نقطہ نظر سے سلطنت کی دائرہ سیل ڈالنی
 منظور نہ تھی۔ آپ ایسی تربیت کی تعمیر فرمائیے تھے جو انسانیت اور

اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور تیغ و خنجر کے بجائے مشرافت نفس کی مدد سے دنیا میں حکومت الہیہ قائم کرے۔ ان تنقیحات کی روشنی میں ظاہر ہے کہ منصب خلافت کا اہل وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف سیرت و کردار کے لحاظ سے مکمل ترین انسان ہو۔ اور دوسری طرف سیاسی عمل و عقد کے اعتبار سے بنی آدم کی امامت کا حق ادا کرے۔

کیئے حالات کا جائزہ لیں کہ حضرت امیر معاویہ کے انتقال کے بعد منصب خلافت کے لئے کیا یزید کی شخصیت موزوں تھی؟ سب سے پہلے اس کے شخصی کردار کا محاسبہ ضروری ہے۔ جس کے لئے کسی خاص تلاش و تفتیش کی حاجت نہیں ہے۔ خود امیر معاویہ کے حاریوں نے اس باب میں جو شہادت پیش کی ہے۔ اس سے حقیقت بالکل بے نقاب ہوتی ہے۔ ا۔ یزید کی جائزینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے بصرہ کے مسلمانوں کو ہمارے کرنے کا کام زیادہ کے تفویض ہوا تو اس نے فوراً اپنی ذمہ داری محسوس کی اور اپنے معتز علیہ عبید بن کوکب کو بلا کر کہا۔

یہ اسلام کا معاملہ ہے۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یزید

جیسا کچھ لا ابالی ظاہر ہے۔ اس لئے تم جا کر امیر المؤمنین کو

یزید کے مشاغل سے آگاہ کرو۔ اور انھیں سمجھا دو کہ میں

وہ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ عبید نے کہا کہ امیر المؤمنین کو یزید

کی جانب سے بدل کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں خود یزید کو سمجھاتا ہوں

کہ وہ اپنے مشاغل کو چھوڑ دے تاکہ لوگوں کو گرفت اور مخالفت کا موقع نہ ملے

تاریخ اسلام حصہ دوم مطبوعہ دارالمصنفین صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵

۲۔ ابتداء سے ہی یزید کی طبیعت استبداد کی جانب مائل تھی۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے بعد حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں عجمی لوگیت کے جو آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ انہوں نے یزید کی فطری اقتاد کو اور زیادہ رنگ آلود کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے مفاد کے تحفظ میں حتیٰ و ناحی جائز و ناجائز وسائل اختیار کرنے میں اسے کوئی دریغ نہ تھا۔

۳۔ کربلا کے مزینہ کے معاً بعد حادثہ حرہ وقوع میں آیا جس میں ہزار ہا صحابہ کرام شہید ہوئے اور مدینہ لوٹا گیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ کے لئے ایک لشکر جرار مکہ معظمہ کو روانہ کیا۔ جہاں لشکر جرار نے اتنی آگ اور پتھر برسائے کہ حرم کعبہ کا فلاف تک جل گیا۔ ان واقعات سے یزید کے متشددانہ اور جاہلانہ میلانات اور طرز عمل کی تصدیق ہوتی ہے۔

۴۔ یزید کے شخصی خصائل کا دامن بھی بے داغ نہیں ہے۔ اس کے حرم میں کئی بیویاں موجود تھیں۔ (تاریخ اسلام حصہ دوم صفحہ ۱۷۱) ان امور سے قطع نظر اگر عجمی مسلمان نے یزید کو یہ طبیعت خاطر خلیفہ منتخب کر لیا ہوتا۔ تو اس کی ذمہ داری بہت کچھ گھٹ جاتی۔ لیکن ان امور سے ہے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں اس اثر و نفو کو استعمال کر کے یہ نتیجہ حاصل کیا کہ عجمی مسلمان نے یزید کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ یہ وہ پہلا بدعت تھی جس سے اسلامی نظام حکومت اور تربیت کا روح بربود ہو گئی اور اسلام کے

سیاسی نصب العین گو یہ ایسا کاری زخم پہنچا جو آج تک مندر نہ ہو سکا۔
 کہا جاتا ہے کہ یزید کی جانشینی کے مسئلہ پر حضرت امیر معاویہ نے
 ہمتصر صحابہ سے مشورے کر کے رائے حاصل کر لیں تھیں۔ لیکن تاریخ
 شواہد سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کوفہ کے
 حاکم مغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہ کی خیر خواہی میں خلافت کا سلسلہ
 بنی امیہ کی نسل میں مستقل کر دینا چاہا۔ چنانچہ یزید کو ادھر توجہ دلائی
 یزید نے امیر معاویہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ امیر نے مغیرہ کے مشورہ کیا اٹھو
 نے کہا۔ "عثمان کی شہادت کے بعد سے مسلمانوں میں جو اختلاف اور
 خوئریزی قائم ہے۔ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اسلئے
 میری رائے میں یزید کی ولید کی بیعت لے کر اسے جانشین
 بنا دینا چاہیے۔ تاکہ جب آپ کا وقت آئے تو مسلمانوں کے لئے
 ایک بہارا اور جانشین موجود رہے۔ اور ان میں خوئریزی اور شاد بریا
 نہ ہو۔" تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۱۲ بحوالہ تاریخ طبری

امیر معاویہ نے دریافت کیا کہ اس ہم کو انجام کون دے گا؟ اس
 وقت سیاسی حیثیت سے کوفہ و بصرہ اور مدینہ ہی حیثیت سے حجاز مسلمانوں
 کے مرکز تھے۔ ان ہی پر اس قسم کے ہمت کا دار و مدار تھا۔ مغیرہ نے کہا کہ
 کوفہ کی ذمہ داری میں لپتا ہوں۔ بصرہ کو زیادہ ہموار کرے گا۔ اور حجاز
 کی ذمہ داری روان بن حکم سے متعلق کی جائے۔
 کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کا بڑا اثر تھا۔ اور یہاں بنی امیہ کے حامیوں کی

بھی ایک جماعت موجود تھی۔ اس لئے بیخبر رہے کہ وہ جاکر یہاں کے چند معززین کا ایک وفد شام بھجوا دیا۔ انہوں نے امیر معاویہ کی خدمت میں حاضر ہو کر خود یزید کی ولیعهدی کی تجویز پیش کی۔

نہایت گوارا امیر معاویہ کا قوت بازو تھا۔ اور اس کی سخت گیری کے سامنے یہ کوئی بڑا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس معاملہ میں اسے بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ کوفہ اور بصرہ سے زیادہ اہم معاملہ حجاز کا تھا۔ یہیں وہ بزرگ تھے۔ جو خود خلافت کے مددگار ہو سکتے تھے۔ اور جس کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت کا خطرہ تھا۔ اسکی ذمہ داری امیر نے مروان بن حکم کے سپرد کی اور اس کو لکھا ”اب میں ضعیف ہو گیا ہوں۔ میرے قوائے کمزور ہو گئے ہیں معلوم

نہیں کہ کب وقت آجائے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے بعد پھر امت میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا جاؤں! اس معاملہ میں ہمارا مشورہ ضروری ہے۔ اس کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کرو۔ اور جو جواب ملے۔ اس سے مجھے مطلع کرو۔“

دستاویز اسلام حصہ دوم صفحہ ۲۵

مروان نے اس مسئلہ کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کیا۔ امیر معاویہ نے خطبے میں کسی جانشین کا نام درج نہیں کیا تھا۔ بلکہ شخص جانشین کی تجویز تھی۔ چونکہ اس حد تک یہ تجویز منید و مناسب تھی۔ سب نے اس سے

اتفاق کیا۔ مروان نے امیر معاویہؓ کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے جانشین کے اعلان کا حکم بھیجا۔ مروان نے یزید کے نام کا اعلان اس کا نام سنتے ہی لوگوں نے اختلاف کیا۔ عبدالرحمان بن ابی بکر نے کہا تم اور معاویہ دونوں غلط کہتے ہو۔ اس سے امت کی بھلائی نہیں ہے۔ بلکہ خلافت کو ہر قتل کی شہنشاہی بنانا چاہتے ہو۔ مروان کہا کہ امیر المومنین چاہتے ہیں کہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی طرح یزید کو نامزد کر جائے۔ عبدالرحمان نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ ابی بکرؓ و عمرؓ کی سنت نہیں ہے۔ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے۔ ان دونوں نے اپنے لوگوں کو ولیعہد نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے خاندان والوں تک کو اس سے دور رکھا۔ یہ تفصیل مروان نے امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجی۔

اس اثنا میں مدینہ بصرہ اور مختلف مقامات کے وفود شہر پہنچ چکے تھے۔ امیر معاویہؓ نے پہلے مدینہ کے ایک بزرگ محمد بن بن حزم سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہر راعی اپنی رعیت کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے جسے آپ امت کا راعی بناتے ہیں اس پر غور کر لیجئے۔ مدینہ کے وفد کے بعد بصرہ کے رئیس ابو قراحت بن قیس جو بڑے مدبر اور بااثر رئیس تھے اسے طلب کی۔ انھوں نے جواب دیا "اگر ہم سب کہتے ہیں تو آپ کا ڈر ہے اور اگر چھوٹے بولتے ہیں

تاریخ السلام حصہ دوم جوالہ تاریخ طبری

زخرا کا خوف ہے آپ یزید کے شب و روز کے مشاغل۔ اس
 بے ظاہری اور پوشیدہ حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ اگر اس
 نے بعد بھی اس کو امت محمدی کے لئے آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ تو پھر اس
 میں صلاح و مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر ایسا نہیں سمجھتے
 زخرو دوسرے عالم کو چلتے ہوئے اس کو دنیا کا گوشہ نہ دیکھئے۔ ورنہ
 یہ تو آپ کا جو حکم ہو اس کا سننا اور بجالانا ہمارا کام ہے۔
 لیکن امیر معاویہؓ یزید کی ولیعہدی طے کر چکے تھے۔ یہ شخص بھی
 کارروائی نہ تھی۔ اس لئے اخیر میں کچھ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور انہیں کو
 لطف و کرم سے ہوا کر لیا۔ اس طرح عراق و شام کے باشندوں
 نے یزید کی بیعت کر لی۔

لیکن اصل معاملہ حجاز کا تھا۔ کیونکہ ہا جرین و انصار کے اہل
 صحابہ اور صحابہ زادے یہیں تھے۔ اس لئے امیر معاویہؓ نے خود کربلا
 پہنچنے کا سفر کیا۔ اس وقت یہاں پانچ بزرگ حضرت عبداللہ بن
 عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، امام حسینؓ اور عبداللہ بن
 ایبے یحییٰ جن کی جانب سے امیر معاویہؓ کو بمثلت کا خطرہ تھا۔
 امیر معاویہؓ نے ان سب سے الگ الگ لکڑیوں کے
 تم پانچوں آدمیوں کے علاوہ سب نے یزید کی ولیعہدی کی تھی۔

مادہ تاریخ اسلام جمعہ دوم بحوالہ تاریخ طبری

کر لی ہے اور تم ان پانچوں کی رہبری کر رہے ہو۔ ان میں سے عبدالرحمن بن ابی کے علاوہ ہر ایک نے جواب دیا کہ میں کسی کی رہبری نہیں کر رہا ہوں۔ آپ چاروں آدمیوں سے کہیے۔ اگر وہ لوگ بیعت کر لیں تو مجھے بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس طرح گویا چاروں آدمیوں سے الگ الگ بیعت کا وعدہ لے لیا۔ عبدالرحمن بن ابی بکرؓ سے اللہ تعالیٰ گفتگو ہوئی ایک اور روایت میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ امیر معاویہ کی آمد کی خبر سن کر یہ پانچوں بزرگ مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ امیر معاویہ بھی وہاں پہنچے اور ان سب کو لطف و مدارات اور حسن خلق سے اہل کرنے کی کوشش کی ان لوگوں نے فرداً فرداً گفتگو کرنے کی بجائے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جو سب میں زیادہ تجربہ کار اور گویا تھے۔ اپنا نمائندہ بنایا۔ امیر نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ میرا جو طرز عمل تھے۔ اور جتنی صلہ رحمی کرتا ہوں اور تمہاری جس قدر باتیں انگیز کرتا ہوں۔ وہ سب تم کو معلوم ہے۔ یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے خلیفہ کا لقب دیدو۔ باقی حکومت کا سارا انتظام۔ عمال کا عزل و نصب۔ خراج کی تحویل و حصول اور اس کا صرف تمہارے ہاتھوں میں رہے گا۔

عبداللہ بن زبیر نے اس کے جواب میں کہا کہ انتخاب خلیفہ کی

تین نظیریں ہیں۔ یا تو رسول اللہ کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجئے۔ مسلمان
 جسے پسند کریں گے۔ منتخب کر لیں گے۔ یا ابو بکر کی طرح ایسے شخص کو
 نامزد کیجئے جس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یا عمر کی طرح چند آدمیوں
 میں سے ایک کا انتخاب شور و غوغا پر چھوڑ دیجئے۔ اس کے علاوہ کوئی
 چوتھا طریقہ ہم قبول نہیں کر سکتے۔

امیر معاویہ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ آسانی کے ساتھ بیعت
 کرنے والے نہیں۔ تو انھیں دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔ کہ اگر تم لوگوں
 نے کوئی مخالفت کی۔ تو تلوار سے کام لیا جائے گا۔ اور باہر نکل کر
 مسلمانوں میں اعلان کر دیا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے سر پر آوردہ اور
 ان کے بہترین لوگ ہیں۔ جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام اہتمام نہیں
 دیا جائیگا۔ انھوں نے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ اس سے آپ لوگ بھی
 بیعت کر لیجئے۔ اہل مدینہ ان ہی بزرگوں کے فیصلے کے منتظر تھے اس لئے
 اس اعلان پر مسلمانوں نے بیعت کر لی۔ امیر معاویہ کی فراہمی کے بعد لوگوں
 اصل واقعہ کا علم ہوا لیکن پھر کسی سے مخالفت نہیں کی۔

امیر معاویہ نے درض الموت کے دنوں میں ایک یزید دشمن میں
 موجود نہ تھا۔ اس کے لئے حسب ذیل وصیت دیا کہ اس کے بعد پھر
 کرائی تاکہ وہ متوقع خطرات سے آگاہ ہو جائے۔ اور نظام حکومت

کو اطمینان بخش طریقے پر چلا سکے۔

جان پدربا میں نے تمہاری راہ کے کانٹے ہٹا کر تمہارے لئے
راستہ صاف کر دیا ہے۔ دشمنوں کو زیر کر کے سائے عرب کی
گردنیں تمہارے آگے جھکا دی ہیں۔ اور تمہارے لئے ایک بڑا
خزانہ جمع کر دیا ہے۔

سب سے اہم معاملہ خلافت کا ہے۔ اس میں حسین بن علیؑ
عبداللہ بن عمرؑ، عبدالرحمن بن ابی بکرؑ اور عبداللہ بن زبیر کے علاوہ
کوئی حریف نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرؑ سے کوئی خطرہ نہیں۔ انھیں
زہر و عبادت کے علاوہ کسی چیز سے واسطہ نہیں۔ عام مسلمانوں
کی بیعت کے بعد بھی کوئی فتنہ ہوگا۔ عبدالرحمن ابی بکرؑ میں
کوئی ذاتی عرصہ یا محبت نہیں ہے۔ جان کے ساتھ کریں گے وہ
اس کے سپر ہو جائیں گے۔ البتہ حسین بن علیؑ کی جانب سے خطرہ
ہے۔ اہل عراق اس میں تمہارے مقابلہ میں لا کر چھوڑیں گے جب
وہ تمہارے مقابلہ میں آئیں۔ اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو جائے
تو درگزر سے کام لیتا کہ وہ قرابت دار۔ بڑے حقدار اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ہیں! البتہ جو شخص بدمعاشی کی طرح کلمے دیکر شیر
کی طرح حملہ کریگا۔ وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ صلح کریں تو تمہارا
قابو پانے کے بعد ان کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ان کے ٹکڑے اڑا دینا
تاریخ اسلام حصہ دوم مطبوعہ دارالمصنفین صفحہ ۲۹

یہ اس رسمی کارروائی کی داستان ہے۔ جو یزید کو خلیفہ بنانے کے لئے اختیار کی گئی تھی۔ اب انکار بیعت کے واسطے میں امام کے منار پر بھی غور کیجئے!

امیر معاویہ کے انتقال کے بعد یزید کے حکم سے جب ولید حاکم مدینہ نے حضرت امام حسین سے بیعت طلب کی تو آپ نے ارشاد فرمایا "مجھ جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا۔ اور نہ میرے لئے یہ ذریعہ ہے۔ جب عام لوگوں کو بیعت کے لئے بلاؤ گے، تو اس وقت میں بھی آجاؤں گا۔ اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیعت میں آپ کا تامل اصولی اختلاف پر مبنی تھا۔ جو یزید کے مقابلہ میں خلافت کے لئے آپ کے حق کو خود امیر معاویہ نے تسلیم کیا ہے۔ تاہم اگر یزید یہ لحاظ اہلیت شرائط خلافت کی تکمیل کر سکتا، اور صحیح اصول پر اس کا انتخاب عمل میں آتا، تو حضرت امام کو بیعت کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔

۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعض خطبوں سے جو آپ نے سفر کے دوران میں ارشاد فرمائے ہیں۔ تشریح ہوتا ہے کہ آپ خلافت کے دعویدار ضرور تھے۔ لیکن اس دعویداری کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ جمہور مسلمین کی رائے کے علی الرغم آپ مندر خلافت پر قابض ہونا چاہتے تھے کہ کوفہ کے راستہ میں اپنے ایک خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا

سلا تہیج اسلام حذر دوم

”اسے لوگو! اگر تم تقویٰ پر رہو اور حقدار کا حق پہچانو۔ تو یہ
 خدا کی خوشنودی کا موجب ہوگا۔ ہم اہل بیعت ان دشمنوں سے زیادہ
 حکومت کے حقدار ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ تم پر ظلم و
 جود سے حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تم ہمیں ناپسند کرو۔ ہمارا حق
 نہ پہچانو۔ اور تمہاری رائے اب اس کے خلاف ہو گئی ہو۔ جو تم نے
 مجھ اپنے خطوں میں لکھی اور قاصد کی زبانی پہنچائی تھی۔ تو میں
 واپس جانے کے لئے بخوشی مینا ہوں۔“

تاریخ ابن جریر و کامل

یزید کو حکومت دلانے میں اگر ملوکیت کا زور و استبداد استعمال
 نہ کیا جاتا۔ اور شولے سے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب ہوتا۔ تو ظاہر ہے کہ
 حضرت امام حسینؑ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی موجودگی میں یزید
 کسی طرح خلیفہ منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر حضرت علیؑ کے بعد حضرت امام حسنؑ اور ان کے بعد حضرت
 امام حسینؑ سے عامہ کی بنا پر خلیفہ منتخب ہوتے۔ تو یہ صورت ہرگز
 توہین نہیں کہی جاسکتی۔ توہین تو یہ ہے کہ باپ اپنی زندگی میں جمہوریت
 کے اقتضائے کے خلاف اپنے بیٹے کو جانشین نامزد کرے اور اس نامزدگی
 سے اختلاف کی ہر آواز کو ملوکیت اور استبداد کے زور سے دبا دیا جائے
 اور۔ توہین کے خلاف احتجاج و تاراضی کے علاوہ حضرت امامؑ کی نظر
 میں یزید کی حکومت غیر شرعی حکومت تھی۔ اس لئے ایسے نظریات

حکومت سے اشتراک عمل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہما و
مفر کونہ میں مقام بیضیہ پر دو دستوں اور دستوں کو مخاطب کر کے
اپنے ارشاد فرمایا۔

اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم
کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے۔ خدا کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے
عہد الہی شکست کرتا ہے۔ سنت نبوی کی مخالفت کرتا ہے
خدا کے بندوں پر گناہ اور سرکشی سے حکومت کرتا ہے
اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا
ہے اور نہ اپنے قول سے۔ تو خدا ایسے آدمیوں کو اٹھا ٹھکانا
نہیں چاہتا گا۔ دیکھو یہ نوک شیطان کے پیرو بن گئے ہیں
رحمان سے سرکش ہو گئے ہیں۔ ونا و ظاہر ہے۔ حدود الہی
معتدل ہے۔ بال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہو۔ انکی سرکشی کو حق و
عدل سے بدل دینے کا میں سب سے زیادہ حقدار ہوں!

(تاریخ ابن اثیر جلد چہارم صفحہ ۴۱۰)

ایک اور خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

افسوس دیکھتے نہیں کہ حق پس نسبت ڈال دیا گیا ہے
باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ
پکڑے بوقت آگیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں بقا الہی کی خواہش
کے لیکن میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ

زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے (تاریخ ابن جریر و کامل)

ایک طرف صدق و صفا۔ ایمان و عمل، صداقت و حق پرستی کا
 غیر متزلزل جذبہ کار فرما تھا۔ اور دوسری طرف حکومت و استیلا جبر و
 استبداد و آمریت و قاپورت اپنے شباب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ غیر ممکن تھا
 کہ ان دو متضاد مکاتیب خیال کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت
 ۴۔ حضرت بشیر کی جانب سے انکار بیعت یزید کی باطل ٹوٹوں کے
 لئے کھلی دعوت مبارزت تھی۔ جب اہل کوفہ نے پیام و سلام کے ذریعہ
 حضرت حسینؑ کو اپنا امام اور مقتدا تسلیم کرنے کا عہد و پیمانہ باندھا تو
 حضرت امام نے اس توقع پر کہ باطل کے مقابلہ میں حق کا محاذ تیار ہو جائے
 اہل کوفہ کی دعوت قبول فرمائی تاکہ نانا کی جو امانت اہل باطل کے
 ہاتھوں تادم لاج ہو رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے اس کی حفاظت و ضیانت کا
 انتظام ہو جائے چنانچہ عزیز واقارب، دوست احباب، ہمد و غمگسار
 سب کی مرضی کے خلاف آپ مدینۃ الرسول سے کوفہ کی جانب چل کھڑے
 ہوئے لیکن راستہ میں جب حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت اور پھر اہل کوفہ
 کی بیوفائی اور بد عہدی کی سہم اطلاعیں سنیں اور دیکھا کہ حق کا ساتھ دینے
 والا کوئی نہیں۔ تو دشمن کے منامتوں کے سامنے تین تجویزیں پیش
 کیں۔ لیکن جب آپ کو نہ تو مدینہ واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ نہ یزید
 کے پاس بھیجا گیا۔ اور نہ سرحدی علاقوں کی طرف آپ کے کوچ کر گوارا
 کیا گیا۔ تو امام کے سامنے اب صرف دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں۔

باطل کے ساتھ اعانت یا ثبات حق کے لئے اس سے تضادم
ان میں سے صاحبِ بد و جنین کے نواسے نے جو راہ اختیار کی۔ اس سے
دنیا واقف ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے سنوٹوں میں تسبیح و سناجات
وہ مذہبِ مردانِ خدامت و خود آگاہ یہ مذہبِ کما و جادات و نہات
غرض امامِ ہمام نے نوکِ خنجر پر بھی حق و صداقت کے ساتھ وابستگی کا
عزم فرمایا۔ اور جس حکومت کو آپ نے غیر اسلامی تصور فرمایا۔ بیعت کے ذریعہ
اس کے ساتھ کسی اشتراکِ عمل پر بھی آمادگی ظاہر نہیں فرمائی۔ ادھر
قدرت نے آپ کے عزم و ایقان کے لئے امتحانِ گاہِ آراستہ کی ابتداء
اور آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وطنِ پاک جو ارسول سے ہجرت فرمائی
راتہ میں مہبت شکن اطلاحوں کا تانا بندا ہوا گیا۔ ہزاروں غمخواروں اور
بہی خواہوں نے مراجعت کا مشورہ دیا۔ لیکن مسترد فرما دیا۔ قادیبیہ کے
مقام پر آپ کے اور عربین تمیمی کے مابین ابن زیاد کے خط کے وصول
ہونے تک آگے نہ بڑھنے کا عہد ہوتا ہے۔ ایسے میں طراح بن عدی
اور ان کے تین ساتھی کوفہ سے آئے ہیں۔ امام ان سے مل کر اہل
کوفہ کی بابت سوال فرماتے ہیں جو اب ملتا ہے۔ عوام کے دل آپ کے
ساتھ ہیں۔ مگر ان کی تلواریں کل آپ کے خلاف نیا مہم سے یا ہر نکالیں گی
طراح بن عدی مشورہ دیتے ہیں۔ ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھیے میرے ساتھ
چلے جائیں اپنے پہاڑ پہنچا جائیں آپ کو اتاروں گا۔ قبیلہ کے

بیس ہزار بہادر تلواریں لئے آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے
 واللہ جب تک ان کے دم میں دم رہے گا۔ آپ کی طرف کوئی آنکھ
 اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔ ہو سکتا تھا کہ جان کو خطرے میں دیکھ کر ایک
 انسان اس مشورہ کو قبول کر لیتا۔ لیکن امام نے شایان شان جواب دیا
 ”خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ لیکن ہمارے اور حور کے درمیان ایک عہد
 ہو چکا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔“
 حُر بن یزید کے استفسار کے جواب میں ابن زیاد نے حکم لکھ بھیجا
 کہ حسین کو کہیں ٹھکنے نہ دو۔ کھلے میدان کے سوا کہیں اترنے نہ دو۔ قلعہ
 بند یا شاداب مقام پر پڑاؤ نہ ڈال سکے۔ ”جب یہ حکم امام کو دیا گیا۔ تو
 آپ کے ساتھی زہیر بن القین نے عرض کی۔ ”حور اور اس کے ساتھیوں
 سے لڑنا اس فوج گراں سے لڑنے کے مقابلہ میں کہیں آسان ہے
 جو بعد میں آئے گی“ مگر آپ نے ان الفاظ کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا
 ”میں اپنی طرف سے لڑائی میں پہل کرنا نہیں چاہتا“ حیرت ناک استقلال اور
 ثبات قدم کے ساتھ خوف، جوع، نقص اموال، انفس و الثمرات کے سامنے
 ابتلاؤں سے گزرتے رہے۔ غنیم کی فوج کا اول بادل ہے۔ دھمکیوں پر دھمکیاں
 دی جا رہی ہیں مگر آپ مقام رضا و تسلیم پر اڑے ہیں۔ یہ منزل بھی گزر گئی۔
 اب دھمکیوں نے عمل کی صورت اختیار کر لی۔ عباسؓ علمدار جیسے قوت بازو
 علی اکبرؓ جیسے جوان و شیر دل فرزند علیؓ اصغرؓ جیسے معصوم اور دوسرے تمام
 حق پرست ساتھی ایک ایک کر کے جام شہادت نوش کر گئے۔ انجام کار

خود بھی دشمن کے مقابلہ میں جو ہر شجاعت دکھا کر وجود حق پر اپنے خون سے شہادت ادا فرمائی ہے

چنان خود انہی داری کہ با ایں بے نیاز بہا
شہادت بر وجود خود ز خون دوستان خواہی

۵۔ یزید کی نامزدگی نہ ہونے کی صورت میں قومی عصیت کے

انتشار اور نزاع و افتراق پیدا ہو جانے کا عذر بھی حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف اسی قدر جواب دیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مسلمہ اساسی اصولوں کو شخص منگامی مصالح پر قربان کر دینا فقدانِ حُرمت کا نتیجہ ہے اسلام زمانہ سازی نہیں بلکہ اس کے برخلاف ہر زمانہ ساز کا درس دیتا ہے۔ اسلام نہ تو وقت کی پیداوار ہے۔ اور نہ وقت کا غلام۔ وقتی رجحانات و بدعات سے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا بلکہ ہر زمانے کی رہنمائی وقت کے غلط میلانات کا مقابلہ کرنا اور اصل اسلام کا نصب العین ہے۔

حاصل کلام حادثہ کربلا اسلامی تاریخ کا جس قدر المناک واقعہ ہے۔ اسی قدر عبرت ناک بھی ہے۔ جس کے اندر بڑی بڑی بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔ جو طالبانِ حق اور متلاشیانِ حقاقت کو دعوتِ فکر و عمل دیتی ہیں۔ یہ کتاب شہادت کے موضوع پر ایسے ہی چند مہیاری مقالات کا مجموعہ ہے جو ملک کے ممتاز اور شاہیر اہل قلم کے نتائجِ فکر ہیں۔ ان میں سے ایک سے ایک سو جو حادثہ کربلا کی نہایت جامع اور

مکمل تاریخ ہے۔ دوسرے تمام مقالوں میں شہادت کے فلسفہ اس کے علاوہ اقدار اور بصائر وغیرہ کی شرح و تفسیر کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اب تک اس قدر مستند اور بلند پایہ لٹریچر اکٹھا نہیں کیا گیا ہے تو قہ ہے کہ صاحبان ذوق سلیم نفیس اکیڈمی کی اس کوشش کو امتحان اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس نے اب تک ہی فلسفہ عجم، فکر اقبال، اور حکمت اقبال جیسے بیش بہا مقالات کے مجموعے شائع کر کے اہل علم سے خراج سچتین حاصل کیا ہے۔

نیل کشیش

محمد عبدالرحمن سعید صدیقی

اش
مولانا ابوالکلام آزاد

داستان کرپلا

دنیا میں انسانی عظمت و شہرت کے ساتھ حقیقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیں عظمت و تقدس اور قبول و شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ دنیا عموماً تاریخ سے زیادہ افسانہ اور تخیل کے اندر انہیں ڈھونڈتا پھاہتی ہے۔ اسی لئے فلسفہ تاریخ کے بانی اول بن خلدون کو یہ قاعدہ بنا دینا پڑا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا۔ اتنی ہی افسانہ سرانی اسے اپنے حصار تخیل میں لے لیگی۔ ایک مغربی شاعر گوٹے نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی عظمت کی حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے۔

تاریخ اسلام میں حضرت امام حسین و علیہ و علی آبا و اجدادہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت جو اہمیت رکھتی ہے محتاج بیان

نہیں۔ خلفائے راشدین کے عہد کے بعد جس واقعہ نے اسلام کی دینی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے کہ وہ ان کی شہادت کا عظیم واقعہ ہے۔ بغیر کسی مبالغہ کے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی المٹاک حادثہ پر نسل انسانی کے اس قدر آنسو نہ بہے ہوں گے۔ جس قدر اس حادثہ پر بہے ہیں۔ تیرہ سو برس کے اندر تیرہ سو عزم گذر چکے اور ہر شرم اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہا۔ امام حسین کے جسم کو نیچکاں سے دشتِ دکر بلا میں جس قدر خون بہا تھا۔ اس کے ایک ایک قطرے کے بدلے دنیا اشکِ ہائے ماتمِ عالم کا ایک سیلاب بہا چکی ہے۔

بائیں ہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تاریخ کا اتنا مشہور عظیم تاثیر رکھنے والا واقعہ بھی تاریخ سے کہیں زیادہ افسانہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اگر آج جو پائے حقیقت چاہے کہ صرف تاریخ اور تاریخ کی محتاط شہادتوں کے اندر اس حادثہ کا مطالعہ کرے۔ تو اکثر صورتوں میں اسے بالو می سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس وقت جس قدر بھی مقبول اور متداول ذخیرہ اس موضوع پر موجود ہے وہ زیادہ تر روضہ خوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ گریہ و بکا کی حالت پیدا کر دینی ہے۔ تاکہ تاریخی حقیقت سے بیان واقعات بعض چیزیں جو تاریخ کی سسٹل میں مرتبہ ہوتی ہیں۔ وہ بھی دراصل تاریخ نہیں ہیں۔ وہ سنہ خوانی اور مجلسیں

طسرازی کے ہوا دی نے ایک دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔

اگر آج جستجو کی جائے کہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کوئی ایک کتاب ایسی موجود ہے جو حادثہ کربلا کی تاریخ ہو۔ تو واقعہ یہ ہے کہ ایک بھی نہیں۔

ذیل میں ہم حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے واردات و حوادث نقل کرتے ہیں۔ یاد ہے کہ اس سلسلے سے مقصود تاریخی بحث و نظر نہیں ہے۔ بلکہ مجرد واقعات شہادت کا اس طرح یک جا کر دینا ہے کہ اس سے ایک مرتب سلسلہ بیان پیدا ہو جائے۔

اہل بیت شروع سے اپنے تمیز خلافت کا زیادہ
 حقدار سمجھتے تھے۔ امیر معاویہ بن ابی سفیان
 کی وفات کے بعد تخت خلافت خالی ہوا۔ یزید بن معاویہ پہلے سے بیعت
 مقرر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اور حسین ابن علی
 علیہ السلام سے بھی بیعت کا مطالبہ کیا۔ حضرت امیر المؤمنین علی
 علیہ السلام نے کو فرقہ دارانہ خلاف قرار دیا تھا۔ اس لئے وہاں اہل
 بیعت کرام کے طرفداروں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے حضرت
 حسین کو لکھا کہ آپ تشریف لائیے۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے
 آپ نے اپنے چمپیرے سبائی مسلم بن عقیل کو اہل کوفہ

سے بیعت لینے کے لیے بھیج دیا۔ اور خود بھی سفر کی تیاری کرنے لگے۔
 آپ کے دوستوں اور عزیزوں کو
دوستوں کا مشورہ معلوم ہوا تو سخت مضطرب ہوئے
 وہ اہل کوفہ کی بیوفائی اور زمانہ سازی سے واقف تھے۔ بنی اُمیہ
 کی سخت گیر طاقتوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے اس سفر کی
 مخالفت کی۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا "لوگ یہ سن کر
 بڑے پریشان ہیں کہ آپ عراق جا رہے ہیں۔ مجھے اصلی حقیقت
 سے آگاہ کیجئے۔"

حضرت حسینؓ نے جواب دیا۔ "میں نے عزم کر لیا ہے۔ آج ہی
 کل میں روانہ ہوتا ہوں۔" ابن عباسؓ بے اختیار پکار اٹھے "خدا
 آپ کی حفاظت کرے۔ کیا آپ ایسے لوگوں میں جا رہے ہیں جنہوں
 نے اپنے امیر کو بے دست و پا کر دیا ہے۔ دشمن کو نکال دیا ہے
 اور ملک پر قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ اگر وہ ایسا کر چکے ہیں۔ تو شوق
 سے تشریف لے جائیے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا ہے۔ حاکم بدستور
 ان کی گردن دبا لے بیٹھا ہے۔ اس کے گماشتے برابر اپنی کارستانیاں
 کر رہے ہیں۔ تو ان کا آپ کو بلانا درحقیقت جنگ کی طرہ سے بلانا
 ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ آپ کو کہیں دھوکہ نہ دیں اور
 جب دشمن کو طاقت درو دیکھیں۔ تو خود آپ سے لڑنے کے
 لئے آمادہ نہ ہو جائیں۔ مگر آپ اس طرح کی باتوں سے متاثر

نہ ہوسے اور اپنے ارادہ پر قائم رہے

جب روانگی کی گھڑی بالکل قریب
ابن عباس کا جوش آگئی تو ابن عباس پھر دوڑے آئے

”اے ابن عم“ انھوں نے کہا ”میں خاموش رہنا چاہتا تھا۔ مگر
 خاموش رہا نہیں جاتا۔ میں اس راہ میں آپ کی ہلاکت اور بربادی
 دیکھ رہا ہوں۔ عراق واسلے دعا باز ہیں۔ ان کے قریب بھی نہ جائیں
 یہیں متیام کیجئے۔ کیونکہ یہاں حجاز میں آپ سے بڑا کوئی نہیں
 ہے۔ اگر عراقی آپ کو بلاستے ہیں۔ تو ان سے کہئے کہ پہلے اپنے
 مخالفین کو اپنے علاقہ سے نکال دو پھر مجھے بلاؤ۔ اگر آپ حجاز سے
 جانا ہی چاہتے ہیں۔ تو یمن چلے جائیے۔ وہاں قلعے اور دشوار گزار
 پہاڑ ہیں۔ ملک کشادہ ہے۔ آبادی عموماً آپ کے والد کی خیر خواہ
 ہے۔ وہاں آپ ان لوگوں کے دسترس سے باہر ہوں گے۔ خطوں
 اور قاصدوں کے ذریعے آپ اپنی دعوت پھیلائیے۔ مجھے یقین ہے
 اس طرح آپ کامیاب ہو جائیں گے
 لیکن حضرت حسینؑ نے جواب دیا۔

”اے ابن عم! میں جانتا ہوں تم میرے خیر خواہ ہو۔ لیکن اب
 میں شرم کر چکا۔“

ابن عباس نے کہا

”آپ نہیں مانتے تو عورتوں اور بچوں کو تو ساتھ نہ لے جائیے

مجھے اندیشہ ہے۔ آپ ان کی آنکھوں کے سامنے اسی طرح نہ تھل
کر ڈالے جائیں۔ جس طرح عثمان بن عفان اپنے گھر والوں کے
سامنے قتل کے گمبختے۔

کتھوری دیر خاموش رہنے کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے
بدشاہین کو کہا۔

اگر مجھے یقین ہوتا کہ آپ کے بال پکڑ لینے اور لوگوں کے
جمع ہونے سے آپ رگہ جائیں گے۔ تو واللہ میں ابھی آپ کی
پیشانی کے بال پکڑ لوں۔

(ابن سیرین)

مگر آپ پھر بھی اپنے ارادہ پر قائم رہے

عبداللہ بن جعفر کا خط
اسی طرح اور بھی بہت سے
لوگوں نے آپ کو سمجھایا۔ آپ

چیمبرے بھائی عبداللہ بن جعفر نے دینے سے خط لکھا۔

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ خط دیکھتے ہی اپنے

ارادے سے باز آجائیں۔ کیونکہ اس راہ میں آپ کے لئے ہلاکت اور

آپ کے اہل بیت کے لئے بربادی ہے۔ اگر آپ قتل ہو گئے تو

زمین کا نور بجھ جائے گا۔ اس وقت ایک آپ ہی ہدایت کا نشان

اور ارباب ایمان کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجئے

میں آتا ہوں۔" (ابن سیرین کا قتل ابن حنفیہ وغیرہ ذالک)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے بزیہ کے مقررہ کئے ہوئے
 والی کا خط والی عمرو بن سعد بن العاص سے جا کر کہا
 حسین ابن علیؑ کو خط لکھ کر ہر طرح مطمئن کر دو۔ عمر نے کہا: آپ
 خود خط لکھ لائیے۔ میں ہر کر دوں گا۔ چنانچہ عبداللہ نے والی کی
 جانب سے یہ خط لکھا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اس راستہ سے
 دور کر دے جس میں ہلاکت ہے اور اس راستہ
 کی طرف رہنمائی کرے۔ جس میں سلامتی ہے۔ مجھے
 معلوم ہوا ہے کہ آپ عراق جا رہے ہیں۔

میں آپ کے لئے شقاق و اختلاف سے پناہ
 مانگتا ہوں۔ میں آپ کی ہلاکت سے ڈرتا ہوں
 میں عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کو آپ
 کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ان کے ساتھ واپس چلے
 آئیے۔ میرے پاس آپ کے لئے امن و سلامتی
 نیکی، احسان اور حسن ہوا ہے۔ خدا اس پر شاہد ہے
 وہی اس کا نگہبان اور کفیل ہے۔ والسلام

مگر آپ بدستور اپنے ارادے پر چلے۔

(د ابن حبریر)

کہ سے آپ عراق کو روانہ ہو گئے
فرزوق سے ملاقات - عجاج نام مقام پر مشہور محب
 اہل بیت شاخ فرزوق سے ملاقات ہوئی۔

آپ نے پوچھا، "تیرے پیچھے لوگوں کا کیا حال ہے؟"
 فرزوق نے جواب دیا، "ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر
 "ملواریں بنی اُمیہ کے ساتھ ہیں" فرمایا "سچ کہتا ہے اب معاملہ اللہ
 ہی کے ہاتھ ہے وہ جو چاہتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ ہمارا پروردگار
 ہر لمحہ کسی نہ کسی حکم فرماتی میں ہے۔ اگر اس کی مشیت ہمارے پسند
 کے مطابق ہوتی اس کی تلاش کریں گے۔ اگر امید کے خلافت ہو
 تو بھی شک نہیں اور تقویٰ کا ثواب کہیں نہیں گیا ہے۔"
 یہ کہا اور سوار می آگے بڑھائی

داہن تبریر

مسلم بن عقیل کے عزیزوں کی خدمت میں شکر و سپاس
 ہو کہ آپ کے نائب مسلم بن عقیل کو کوئی ہیرا پزیر کے گورنر بھیجا
 بن زیاد نے حکمائے قتل کر دیا۔ اور کسی کے کان پر چول تکس نہ رہی
 آپ نے مناجات بار بار در اللہ عزنا اللہ (پڑھنا شروع
 کیا۔ لعین ساجیوں نے کہا۔
 اب بھی وقت ہے۔ ہم آپ کے اور آپ کے اہل بیت کے

معاہدہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتے ہیں۔ اللہ یہیں سے لوٹ چلے
 کوفہ میں آپ کا کوئی اور طرف دار اور مددگار نہیں ہے۔ سب
 آپ کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔

آپ خاموش کھڑے ہو گئے اور واپسی پر غور کرنے لگے لیکن
 مسلم بن عقیل کے عزیز کھڑے ہو گئے۔ واللہ ہم ہرگز نہ ٹلیں گے،
 انہوں نے کہا: ہم اپنا انتقام لیں گے یا اپنے بھائی کی طرح
 مرجاویں گے۔ اس پر آپ نے ساتھیوں کو نظر اٹھا کر
 دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "ان کے بعد زندگی کا
 کوئی مزہ نہیں۔"

داہن سپرد

راستہ میں کھیر چھڑا گئی بدوؤں کی ایک جماعت آپ کے
 ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے
 کوفہ میں خوب آرام کریں گے۔ آپ ان کی حقیقت سے خوب واقف
 تھے۔ سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا۔

"اے لوگو! ہمیں نہایت دہشت ناک خبریں پہنچی ہیں۔ مسلم بن
 عقیل ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن لبطر قتل کر ڈالے گئے۔ ہمارے
 طرف داروں نے بے وفائی کی۔ کوفہ میں ہمارا کوئی مددگار نہیں
 جو ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہے چھوڑ دے۔ ہم ہرگز خفا نہ ہوں گے۔
 یہ سن کر بھیسر ڈائیں ہائیں کٹنا شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر
 بعد آپ کے گرد ہی آدمی رہ گئے۔ جو مکہ سے آپ کے ساتھ

چلے تھے۔

(ابن جریر)

قاسم سے جوں ہی آگے بڑھے عبید اللہ

بن زیاد والی عراق کے عامل حسین

حربین یزید کی آمد

بن امیر مٹی کی طرف سے حرب بن یزید ایک ہزار فوج کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور ساتھ ہو لیا۔ اسے حکم ملا تھا۔ کہ حضرت حسینؑ کے ساتھ برابر لگا رہے۔ اور اس وقت تک بچھا نہ چھوڑے۔ جب تک انہیں عبید اللہ بن زیاد کے روبرو نہ لے جائے۔ اسی اثناء میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ آپ تہہ بند باندھے چادر اوڑھے نعلین پہنے تشریف لائے۔ اور حمد و نعت کے بعد اپنے ساتھیوں اور حاضر سپاہیوں کے سامنے خطبہ دیا۔

اے لوگو! خدا کے سامنے اور تمہارے

سامنے میرا یہ عذر ہے کہ میں اپنی

راہ میں ایک خطبہ

طرف سے یہاں نہیں آیا ہوں۔ میرے پاس تمہارے خطوط پہنچے قاصد آئے۔ مجھے بار بار دعوت دی گئی کہ تمہارا کوئی امام نہیں آپ آئیے۔ تاکہ خدا ہمیں آپ کے ہاتھ پر جمع کرے۔ اگر اب بھی تمہاری یہ حالت ہے۔ تو میں آگیا ہوں۔ اگر مجھے عہد و پیمانہ کرنے کے لئے ہو۔ جن پر میں مطمئن ہو جاؤں۔ تو میں تمہارے شہر پہنچنے کو تیار ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم میری آمد سے ناخوش ہو تو میں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ جہاں سے آیا ہوں۔

دشمنوں نے ایک لمحے نماز پڑھی کسی نے کوئی جواب
 خاموش رہنے کے بعد لوگ موزن سے کہنے لگے "اقامت پکارو"
 حضرت حسینؑ نے حرمین یزید سے کہا "کیا تم علیحدہ نماز پڑھو گے؟
 اس نے کہا "ہمیں آپ امامت کریں۔ ہم آپ ہی کے نماز
 پڑھیں گے۔"

وہیں عصر کی بھی نماز پڑھی۔ دوست دشمن سب مقتدی تھے
 نماز کے بعد آپ نے پھر خطبہ دیا۔

اے لوگو! اگر تم تقویٰ پر رہو۔ اور حقدار
 کا حق پہچانو تو خدا کی خوشنودی کا موجب
 ہوگا۔ ہم اہل بیت ان مدعیوں سے زیادہ حکومت کے
 حقدار ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ تم پر ظلم و
 جور سے حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تم ہمیں ناپسند کرو۔ ہمارا
 مشرف پہچانو اور تمہاری رائے اب اس کے خلاف ہو گئی ہو
 تو تم نے مجھے اپنے خطوں میں لکھی اور قاصدوں کی زبانی
 پہنچائی تھی۔ تو میں واپس چلے جانے کے لئے مجبوری
 نیا ہوں۔"

اس پر حشر نے کہا "آپ کن خطوط
 اہل کوفہ کے خطوط کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے خطوط کا

کوئی ر علم نہیں۔“

آپ نے عقبہ بن سمان کو حکم دیا کہ وہ دو لٹری تھیلے نکال لائے۔ جن میں کوفہ والوں کے خطوط بھرے ہیں۔“ عقبہ نے تھیلے انڈیل دیئے اور خطوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اس پر حر نے کہا۔ لیکن ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے یہ خطوط لکھے تھے۔ ہمیں تو یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو عبید اللہ بن زیاد تک پہنچانے کے چھوڑیں۔“

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا۔ ” لیکن یہ موت سے پہلے ناممکن ہے۔“

پھر آپ نے روانگی کا حکم دیا۔ لیکن نماز لینے کے راستہ روک لیا۔ آپ نے خفا ہو کر حر سے کہا ” تیری ماں کچھ روسے۔ تو کیا چاہتا ہے۔“

حر نے جواب دیا ” واللہ اگر آپ کے سوا کوئی اور عرب میری ماں کا نام زبان پر لائے تو میں اسے تباہ دیتا۔ لیکن آپ کی ماں کا ذکر میری زبان پر ہرائی کے ساتھ نہیں آسکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ” پھر تم کیا چاہتے ہو۔“

اس نے کہا ” میں آپ کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔“ آپ نے فرمایا ” تو واللہ میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا۔“

اس نے کہا۔ ” میں بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

جب گفتگو زیادہ بڑھی تو صحنے کہا۔ ”مجھے آپ سے لڑنے کا حکم نہیں ملا ہے۔ مجھے صرف یہ حکم ملا ہے کہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ یہاں تک کہ آپ کو کوفہ پہنچا دوں۔ اگر آپ اسے منظور نہیں کرتے۔ تو ایسا راستہ اختیار کیجئے۔ جو نہ کوفہ جاتا ہو نہ مدینہ میں ابن زیاد کو لکھتا ہوں۔ آپ اگر پسند کریں تو خود بھی یزید یا عبید اللہ کو لکھئے۔ شاید خدا میرے لئے نخلصی کی کوئی صورت پیدا کرے۔ اور آپ کے معاملہ میں امتحان سے بچ جاؤں“

یہ بات آپ نے منظور کر لی۔ اور روانہ ہو گئے

(درجہ و کامل)

راستہ میں کئی اور مقامات پر بھی آپ نے ایک اور خطبہ دو سنتوں اور دشمنوں کو مخاطب کیا

مقام بقیعہ پر آپ نے خطبہ دیا۔

”اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے۔ جو ظلم کرتا ہے۔ خدا کی قسم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے۔ عہد الہی شکست کرتا ہے۔ سنت نبوی کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا کے بندوں پر گناہ اور سرکشگی سے حکومت اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور نہ اپنے قول سے۔ سو خدا ایسے آدمی کو اچھا ٹھکان نہیں دیتے گا۔ دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیروں گئے۔ رحمان

سے سرکش ہو گئے ہیں۔ فنا و ظاہر ہے۔ حدود الہی معطل ہو کر
مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حرام کو حلال اور
حلال کو حرام ہٹا دیا جا رہا ہے۔ میں ان کی سرکشی کو حق و عدل
سے بدل دینے کا سب سے زیادہ مستدار ہوں۔ تمہارے
بے شمار خطوط اور قاصد میرے پاس پیام بیعت لے کر پہنچے
تم عہد کر چکے ہو کہ نہ تو تم مجھ سے بے وفائی کرو گے۔ نہ مجھے دشمنوں
کے حوالے کرو گے۔ اگر تم اپنی بیعت پر قائم رہو۔ تو یہ تمہارے
لئے راہ ہدایت ہے۔ کیونکہ میں حسین بن علی ابن فاطمہ رسول اللہ
کا نواسہ ہوں۔ میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے۔ میرے
بال بچے تمہارے بال بچوں کے ساتھ ہیں۔ مجھے اپنا نمونہ بناؤ۔
اور ٹھہرے گردن نہ موڑو۔ لیکن اگر تم یہ نہ کرو۔ بلکہ اپنا عہد
توڑو اور اپنی گردن سے بیعت کا حلقہ نکال پھینکو۔ تو یہ بھی تم
سے بعید نہیں۔

تم میرے باپ بھائی اور عم زاد مسلم سے ایسا ہی کر چکے ہو۔
وہ فریب خوردہ ہے۔ جو تم پر بھروسہ کرے۔ لیکن یاد رکھو تم نے
اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ اور اب بھی اپنا ہی نقصان کرو گے تم
نے اپنا ہی حصہ کھو دیا۔ اپنی قسمت بگاڑ دی۔ جو بارگاہی گروہ کا خود
اسیٹے خلاف بد عہد ہی کر لیا۔ عجیب نہیں فرماؤ تم نے مجھ سے بیعت
نیاز کروا کر۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ (ابن جریر اور کمال)

ایک اور تقریر
 ایک دوسری جگہ یوں تقریر فرمائی
 "معاذ کی جو صورت ہو گئی ہے تم دیکھ
 رہے ہو۔ دنیا نے اپنا رنگ بدل دیا۔ منہ پھیر لیا۔ نیکی سے خالی
 ہو گئی۔ ذرا سی تلچھٹ باقی ہے۔ حقیر سے زندگی رہ گئی ہے۔
 ہولناکی نے احاطہ کر لیا ہے۔ افسوس دیکھتے نہیں حق پس
 پشت ڈال دیا گیا ہے۔ باطل پر ملائیہ عمل کیا جا رہا ہے کوئی
 نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ
 میں بہتار لہائی کی خواہش کرے۔ لیکن میں شہادت ہی کی
 موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بچانے خود
 ایک تبسم ہے"

یہ خطبہ سن کر زہیر بن الیقین ابلی نے
 کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا۔ "تم لوگ
 بڑا بڑا جواب
 لوگوں کے پاس بولوں؟"

سب نے کہا "تم بولو" زہیر نے تقریر کی
 "انے فرزند رسول! خدا آپ کے ساتھ ہوا ہم نے آپ کی تقریر
 سنی۔ واللہ اگر دنیا ہمارے لئے ہمیشہ باقی رہنے والی ہو۔ اور ہم
 سدا اس میں رہنے والے ہوں۔ جب بھی آپ کی حمایت و
 نصرت کے لئے اس کی جدائی گوارا کر لیں گے۔ اور ہمیشہ کی زندگی
 پر آپ کے ساتھ رہ جانے کو ترجیح دیں گے۔" (ابن جریر اور کمال)

حر بن یزید آپ کے ساتھ برابر
 حر کی دھمکی کا جواب چلا آ رہا تھا۔ بار بار کہتا تھا
 "اے حسین! اپنے معاملہ میں خدا کو یاد کیجئے۔ میں گواہی دیتا ہوں
 کہ اگر آپ جنگ کریں گے۔ تو ضرور قتل کر ڈالے جائیں گے۔"
 ایک مرتبہ آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا: "تو مجھے موت
 سے ڈراتا ہے۔ کیا تمہاری شقاوت اس حد تک پہنچ جائیگی
 کہ مجھے قتل کر دو گے؟ مجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا جواب دوں؟
 لیکن میں وہی کہوں گا جو رسول اللہ کے ایک صحابی نے جہاد پر
 جاتے ہوئے اپنے بھائی کی دھمکی سن کر کہا تھا۔

میں روانہ ہوتا ہوں۔ مرد کے لئے موت، ذلت
 نہیں ہے۔ جب کہ اس کی نیت نیک ہو اور اسلام
 کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔

اور جب کہ وہ اپنی جان دے کر صالحین کا مددگار
 ہو۔ اور دنیا پارہ ظالم ہلاک ہونے والے سے چلا

ہو رہا ہو۔ (داہن جریر و کابل)

عذیب الہجانات نام مستام پر
 چار کوفیوں کی آمد کوفہ سے چار سوار آتے ہوئے
 دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے طرح باح بن عدی یہ شعر پڑھ رہا تھا
 اے میری اونٹنی! میری ڈانٹ سے ڈر نہیں

طلوع فجر سے پہلے ہمت سے چلے ()
 سب سے اچھے مسافروں کو لے چلے۔ سب سے اچھے
 سفر پر چلے۔ یہاں تک کہ شریف النیب آدمی تک
 پہنچ گیا ()

وہ عزت والا ہے۔ آزاد ہے۔ سراخ عیندہ ہے

اللہ سے سب سے اچھے کام کے لئے لایا ہے ()
 حضرت حسین نے یہ شعر سنا۔ تو فرمایا: "واللہ مجھ ہی امید
 ہے کہ خدا کو ہمارے لئے کھلائی منظور ہے۔ چاہے قتل ہوں۔ یا
 قہقہا ہوں۔"

حرمین یزید نے ان لوگوں کو دیکھا۔ تو حضرت سے کہا: "یہ لوگ
 کوفہ کے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہی نہیں ہیں۔ میں انہیں روکوں گا۔
 واپس کر دوں گا۔"

آپ نے فرمایا کہ تم وعدہ کر چکے ہو۔ کہ اپنا زیاد کا خط آنے
 سے پہلے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ یہ اگرچہ میرے ساتھ
 نہیں آئے۔ لیکن میرے ہی ساتھ ہی ہیں۔ اگر ان سے چھڑ چھپا
 کر دوں گے۔ تو میں تم سے لڑوں گا۔" یہ سن کر حرمین غاموش
 ہو گیا۔

آنے والوں سے آپ نے
 پوچھا۔ لوگوں کو کس حال

کوفہ والوں کی حالت

میں چھوڑ آئے ہو! انھوں نے جواب دیا "شہر کے سرداروں
کو رشوتیں دے کر ملا لیا گیا ہے۔ عوام کے دل آپ کے ساتھ ہیں
مگر ان کی تلواریں کل آپ کے خلاف نبیام سے باہر نکلیں گی۔"

داہن جبر و کمال

آپ کے قاصد کا قتل اس سے پہلے آپ قیس بن مشہر
کو بطور قاصد کو ذبح بھیج چکے تھے

عبید اللہ بن زیاد نے انھیں قتل کر ڈالا تھا۔ مگر آپ کو اس
کی اطلاع نہ تھی۔ ان لوگوں سے قاصد کا حال پوچھا۔ انھوں
نے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور

شرمایا رمنہد من قضی الجند و منہد من بنتظر و ما

بد لو متید یلا (بعض ان میں سے مرچکے ہیں۔ اور بعض

موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر حق پر ثابت قدم ہیں۔ اس میں

کوئی تبدیلی نہیں کی ہے)

خدا یا ہمارے لئے اور ان کے لئے جنت کی راہ کھول

دے۔ اپنی رحمت اور ثواب کے دارالقرار میں ہمیں اور

انھیں جمع کر۔ "

طرح بن عدی کا مشورہ

طرح بن عدی نے کہا۔ واللہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھ رہا ہوں۔ مگر آپ کے ساتھ کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ اگر صرف یہی لوگ ٹوٹ پڑیں جو آپ کے پیچھے لگے ہیں۔ تو خامتہ ہو جائے۔ میں نے جتنا بڑا انبوہ آدمیوں کا کوفہ کے عقب میں دیکھا ہے۔ اتنا کسی مقام پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب اس لئے جمع کئے گئے ہیں۔ کہ ایک حسین سے لڑیں۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں دشمنوں سے بالکل امن ہو۔ تو میرے ساتھ چلے چلیے۔ میں اپنے پہاڑ آجاؤں میں آپ کو اتاروں گا۔ واللہ وہاں دس دن بھی نہ گزریں گے۔ کہ قیدی طے کے بیس ہزار بہادر تلواریں لئے آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ واللہ جب تک ان کے دم میں دم رہیگا۔ آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔

آپ نے جواب دیا۔

خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ لیکن ہمارے اور ان کے مابین ایک عہد ہو چکا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا ان کا معاملہ کس حد پر پہنچ کر ختم ہوگا۔

داہن جریر و کابل

اب آپ کو لفتین ہو چلا تھا کہ موت کی طرف جا رہے ہیں۔ "قصر بنی مقاتل" نامی مقام

نواب

سے کوچ کرتے وقت آپ اونگھ گئے تھے۔ پھر چونک کر باواز بلند کہنے لگے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الحمد للہ رب العالمین تین مرتبہ یہی فرمایا، آپ کے صاحبزادے علی اکبر نے عرض کیا۔ یہ انا للہ وانا الحمد للہ کیوں؟

فرمایا۔ جان پورا ابھی اونگھ گیا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار کہتا چلا جا رہا ہے۔ لوگ چلتے ہیں اور موت ان کے ساتھ چلتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہماری موت کی خبر ہے۔ جو ہم کو سنائی جا رہی ہے۔

علی اکبر نے کہا۔ "فدا آپ کو روز بد نہ دکھائے! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔؟" فرمایا۔ "بے شک ہم حق پر ہیں۔ اس پر وہ ڈوبے اختیار پکار اٹھے۔" اگر ہم حق پر ہیں۔ تو کھپس رہیں موت کی کوئی پرواہ نہیں۔"

یہی وہ آپ کے صاحبزادے ہیں جو میدان کربلا میں شہید ہوئے اور علی اکبر کے لقب سے مشہور ہیں۔

(ابن جریر شریح بن ابی عمیر رضی اللہ عنہما)

صبح آپ پھر سوار ہوئے اپنے ساتھ سے ایک زباؤ کا حیلہ کو پلانا شروع کیا۔ مگر خیر بن یزید انھیں پھیلے سے روکتا تھا۔ باہم دیر تک کشمکش جاری رہی۔ آخر کوفہ کی طرف سے ایک سوار آنا دکھائی دیا۔ یہ بھیار بند تھا۔

حضرت حسین کی طرف سے اس نے منہ پھیر لیا۔ مگر حر کو سلام کیا اور
ابن زیاد کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

حسین کو کہیں ٹھکنے نہ دو۔ کھلے میدان کے دو
کہیں اترنے نہ دو۔ قلعہ بند شاہ اب مقام میں پڑاؤ
نہ ڈال سکے۔ میرا بھی قاصد تمہا سے ساتھ رہے گا اور
دیکھتا رہے گا کہ تم کہاں تک میرے حکم کی تعمیل
کرتے ہو۔

حر نے خط کے مضمون سے حضرت امام کو آگاہ کیا۔ اور کہا کہ اب
میں مجبور ہوں۔ آپ کو بے آب و گیاہ کھلے میدان میں ہی اترنے کی
اجازت دے سکتا ہوں۔

زمیر القین نے حضرت سے عرض کیا۔ "ان لوگوں سے لڑنا اس
فوج گراں سے لڑنے کے مقابلہ میں کہیں آسان ہے۔ جو بعد
میں آئے گی۔"

مگر آپ نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ میں اپنی طرف سے لڑائی میں
پہل نہیں کرنا چاہتا۔" زمیر نے کہا۔ تو پھر اس سامنے کے گاؤں
میں چل کر اتریں۔ جو فرات کے کنارے ہے۔ اور قلعہ بند
ہو جانا چاہیے۔"

آپ نے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟" زمیر نے کہا "عقر" و عقر
کے معنی ہیں کاٹنا۔ یا بے ثمر و نتیجہ ہونا) یہ سن کر آپ منغض ہو گئے

اور کہا "عقرے خدا کی پشاہ بہ"

(ابن جریر و کامل)

آخر ۲۲ خرم الحرام ۱۳۳۸ھ کو آپ ایک
 کربلا میں ورود اجازت سوزہ میں پر پہنچ کر انہ پر سے پوچھا
 اس سوزہ میں کا نام کیا ہے؟ "معلوم ہوا کہ بلا" آپ نے فرمایا
 یہ کرب اور بلا ہے۔ یہ مقام دریا سے دور تھا۔ دریا اور اس میں
 ایک پہاڑی حالت تھی۔

(الامۃ واسیما یہ)

دوسرے دن عمر بن سعد بن ابی و فاص
 عمر بن سعد کی آمد کوفہ والوں کی چار ہزار فوج لے کر آیا
 عبید اللہ بن زیاد نے عمر کو زبردستی پھینچا تھا۔ عمر کی خواہش تھی کہ
 کسی طرح اس امتحان سے بچ سکے۔ اور معاملہ رفع دفع ہو جائے اس
 نے آئے ہی حضرت حسینؑ کے پاس قاصد بھیجا۔ اور دریافت کیا آپ
 کیوں تشریف لائے؟ آپ نے وہی جواب دیا۔ جو حسینؑ بن زیاد
 کو دے چکے تھے، تمہارے اس شہر کے لوگوں ہی نے بے
 بلا یا ہے۔ اب اگر وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ تو میں لو شہر چھوڑنے
 کے لئے تیار ہوں۔

عمر بن سعد کو اس جواب سے خوشی ہوئی
 ابن زیاد کی منہی اور امید بندھی کہ یہ مصیبت تل ہائے گی

چنانچہ عید اللذین زیاد کو خط لکھا۔ خط پڑھ کر ابن زیاد نے کہا۔

اب ہمارے پنجہ میں آ پھنسا ہے۔ چاہتا ہے کہ نجات پائے۔ مگر اب واپسی اور نکل بھلنے کا وقت نہیں رہا۔

پھر وہ آپ لکھو پایا۔

حسین سے کہو پہلے سے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ یزید بن معاویہ کی بیعت کریں۔ پھر ہم دیکھیں گے۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ حسین اور ان کے ساتھیوں تک پانی نہ پہنچنے پائے۔ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی پینے نہ پائیں۔ جس طرح عثمان بن عفان پانی سے محروم تھے۔

عمر بن سعد نے مجبوراً پانسو سپاہی گھاٹ پانی پر لکھا دم کی حفاظت کے لئے بھیج دیئے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں پر پانی بند ہو گیا۔ اس پر آپ نے اپنے بھائی عباس بن علی کو حکم دیا کہ نسیں سوار اور بیس پیادے لے کر جائیں اور پانی بھر لائیں۔ یہ پہنچنے تو حافظ دستے کے انسیر عمرو بن الحجاج نے روکا۔ باہم مقابلہ ہوا۔ لیکن آپ بیس مشکیں پانی کی بھر لائے۔

شام کو حضرت حسین نے عمرو
 بن سعد کے ملاقات
 محمد سے ملاقات کرو۔ چنانچہ دونوں بیس بیس سوار کے کر اپنے
 پڑاؤ سے نکلے اور درمیانی مقام میں ملے۔ تجلیہ میں بہت رات گئے
 تک باتیں ہوتی رہیں۔ ردا ہی کہتا ہے کہ گفتگو بالکل خفیہ تھی۔
 لیکن لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ حضرت امام نے عمر سے کہا کہ ہم تم دونوں
 اپنے اپنے لشکر ہیں چھوڑ کر بڑے بڑے پاس روانہ ہو جائیں۔ عمر
 نے کہا۔ "اگر میں ایسا کروں گا۔ تو میرا گھر کھسکے گا اور اہل
 جائے گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں بنا دوں گا۔" عمر نے کہا۔ "میری تمام
 جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔"
 آپ نے فرمایا۔ "میں اپنی حجاز کی جائیداد سے اس کا معاوضہ
 دے دوں گا۔ مگر عمر نے منظور نہیں کیا۔"

(ابن جریر و حنیفرہ)

اس کے بعد کئی تین چار مرتبہ باہم ملاقاتیں
 ہوئیں۔ آپ نے تین صورتیں پیش کیں۔
 ۱۔ آپ کو وہاں لڑنا ہے اور وہاں سے آیا ہوں
 ۲۔ آپ کو مجھ پر پیر سے اپنا معاملہ طے کر لینا دو
 ۳۔ وہاں مسلمانوں کی کسی مسجد پر پھینچ دو۔ وہاں کے لوگوں پر

جو گزرتی ہے۔ وہ مجھ پر گزرے گی۔

عمر کا خطا۔

بار بار کی گفتگو کے بعد عمر بن سعد نے ابن زیاد کو خط لکھا۔

خدا نے فتنہ ٹھنڈا کر دیا۔ پھوٹ دور کر دی

اتفاق پیدا کر دیا۔ امت کا معاملہ درست کر دیا حسین

مجھ سے وعدہ کر گئے ہیں۔ کہ وہ ان تین صورتوں میں

سے کسی ایک کے لئے تیار ہیں۔ اس میں تمہارے

لئے بھی بھلائی ہے اور امت کے لئے بھی

بھلائی ہے۔

ابن زیاد نے خط پڑھا تو متاثر ہو گیا

عمر بن سعد کی تعریف کی اور کہا میں نے

شمر کی مخالفت

منظور کیا۔ مگر شمر بن ذی الجوشن نے مخالفت کی اور کہا۔ "اب کے

حسین قبضہ میں آچکے ہیں۔ اگر آپ کی اطاعت کے بغیر نکل گئے تو

عجیب نہیں عزت و قوت حاصل کر لیں۔ اور آپ کمزور و عاجز قرار

پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ اب انھیں قابو سے نکلنے نہ دیا جائے جب

تک وہ آپ کی اطاعت نہ کر لیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسین اور عمر

رات رات بھر باہم سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔

ابن زیاد نے یہ رائے پسند کر لی اور شمر کو

ابن زیاد کا پورا خط دیکر بھیجا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

”کہ اگر حسین معہ اپنے ساتھیوں کے اپنے آپ کو
ہماری سولے کر دیں۔ تو لڑائی نہ لڑی جائے۔ اور
انھیں صحیح سالم میرے پاس بھیجا جائے۔ لیکن
اگر یہ بات وہ منظور نہ کریں۔ تو پھر جنگ کے سوا
چارہ نہیں بھرتے کہا ہے۔ کہ اگر عمر بن سعد نے
میرے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا۔ جب تو تم اسکی اطاعت
کرنا۔ ورنہ چاہیے کہ اسے ہٹا کر خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ
میں لے لیتا۔ اور حسین کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دیتا۔“

ابن زیاد کے اس خط میں عمر کو یہ سخت تہدید بھی کی گئی تھی۔ کہ میں
نے تمہیں اس لئے نہیں بھیجا ہے۔ کہ حسین کو بچاؤ۔ اور میرے پاس
سفارشیں بھیجو۔ دیکھو میرا حکم صاف ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو حواسے
کر دیں۔ تو صحیح سالم میرے پاس بھیجو۔ لیکن اگر انکار کریں۔ تو بے تامل
ہملہ کرو۔ خون بہاؤ لاش بگاڑو۔ کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔
قتل کے بعد ان کی لاش گھوڑوں سے روند ڈالنا۔ کیوں کہ وہ
بائنمی ہیں۔ اور جماعت سے نکل گئے ہیں۔ میرا سنے عہد کر لیا ہے۔ کہ
اگر قتل کروں گا۔ تو یہ ضرور کروں گا۔

اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل کی تو انعام و اکرام کے مستحق ہو گے
اور اگر نافرمانی کی تو معزول کیے جاؤ گے۔

(ابن ہشیر)

شہر بن ذمی الجوشن اور حضرت حسینؑ کے متعلق یاد رکھنا

چلیے کہ اس کی پھوپھی ام المومنین بنت خرازم امیر المومنین علی علیہ السلام کی زوجیت میں تھیں۔ اور انھیں کے بطن سے چار صاحبزادے عباس عبداللہ جعفر اور عثمان پیدا ہوئے تھے جو اس معرکہ میں امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔ اس طرح شہر بن ذمی الجوشن کے واسطے سے حضرت

امام کا پھوپھی پیرا بھائی تھا۔ اس نے ابن زیاد سے درخواست کی تھی کہ اس کے ان عزیزوں کو امان دے دی جائے۔ اور اس نے منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے میدان میں چاروں صاحبزادوں کو بلا کر کہا "تم میرے دادھیالی ہو۔ تمہارے لئے میں نے امن و سلامتی کا سامان کر لیا ہے۔"

لیکن انھوں نے جواب دیا "اسٹوس تم پر تم ہمیں تو امان دیتے ہو لیکن فرزند ان رسول اللہ کے لئے امان نہیں ہے۔"

شہر نے ابن سعد کو حاکم کوفہ کا خط پہنچا دیا۔ اور وہ طوعاً و کرہاً بخوف عزول آنا وہ تمہیل ہو گیا۔

(ابن حبیہ)

نماز عصر کے بعد شہر بن سعد نے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ جب

فوج کی ابتدائی حرکت

قریب پہنچا۔ تو حضرت عباسؑ بیس سواروں کے ساتھ نمودار ہوئے

عمر نے ان سے کہا کہ "ابن زیاد کا جواب آگیا ہے۔ اور اس کا مضمون

یہ ہے۔

حضرت عباس واپس لوٹے کہ حضرت حسین کو اس کی اطلاع دی۔ اس اثنا میں فریقین کے بعض پرچوں آدیوں میں جو رد و کد ہوئی۔ اسے راویوں نے محفوظ رکھا ہے۔

حضرت امام کے

دونوں فریقوں میں نہ پائی روکد طرفداروں میں سے صیب ابن مظاہر نے کہا کہ "خدا کی نظر میں بدترین لوگ وہ ہیں گے جو اس کے حضور اس حالت میں پہنچیں گے کہ اس کے بنی کی اولاد اور اس کے شہر (کوفہ) کو پہنچد گزار عابدوں کے خون سے ان کا ہاتھ رنگین ہوگا۔"

ابن سعد کی فوج میں سے عذرہ بن قیس نے جواب دیا "شاہد اپنی خوب بڑائی کرو۔ پیٹ بھر کے اپنی پاکی کا اعلان کرو۔" زہیر بن القین نے کہا۔ "اے عذرہ! خدا ہی نے ان نفوس کو پاک کر دیا ہے۔ اور ہدایت کی راہ دکھائی ہے۔ خدا سے ڈرا اور ان پاک نفسوں کے قتل میں مگرا ہی کا مددگار نہ بن۔"

عذرہ نے جواب دیا۔ "زہیر! تم لو اس خاندان کے حامی نہ تھے کیا آج سے پہلے تم غمناک رہتے تھے؟"

حامی انہ کے؟

زہیر نے کہا: "ہاں یہ سچ ہے۔ میں نے حسینؑ کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ نہ کبھی کوئی قاصد بھیجا۔ لیکن سفر نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ میں نے انھیں دیکھا تو رسول اللہؐ یاد آگئے۔ رسول اللہؐ کی ان سے محبت یاد آگئی۔ میں نے دیکھا یہ کتنے قوی دشمن کے سامنے جا رہے ہیں۔ خدا نے میرے دل میں ان کی محبت ڈال دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ان کی مدد کروں گا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے اس حق کی حفاظت کروں گا۔ جسے تم نے ضائع کر دیا ہے۔"

امام حسینؑ کو جب ابن زیاد کے خط کا مضمون معلوم ہوا۔ تو انھوں نے کہا: "اگر ممکن ہو تو آج انھیں مال دو۔ تاکہ آج رات اپنے رب کی اور نماز پڑھ لیں۔ اس سے دعا کریں۔ مغفرت مانگیں کیونکہ وہ جانتا ہے میں اس کی عبادت کا دلدادہ اس کی کتاب کا پڑھنے والا ہوں۔"

چنانچہ یہی جواب دیا گیا۔ اور فوج واپس آگئی۔
(ابن جریر و بیہقی)

آپ کی حسرت اور احباب کی وفاداری
فوج کی واپسی کے بعد رات کو آپ نے اپنے ساتھی جمع کئے
اور خطبہ دیا۔

خدا کی حمد و تائیس کرتا ہوں۔ رنج و راحت ہر حالت میں اس کا شکر گزار ہوں۔ الہی۔ تیرا شکر کہ تو نے ہمارے گھر کو نبوت سے مشرف کیا۔ قرآن کا نہم عطا کیا۔ دین میں سمجھ بھگت بخشی۔ اور ہمیں دیکھنے، سننے اور عبرت پکڑنے کی قوتوں سے سرفراز کیا، انا العبد لوگو! میں نہیں جانتا آج رونے زمین پر میرے ساتھیوں کے اہل بیت اور بہتر لوگ موجود ہیں۔ یا میرے اہل بیت سے زیادہ ہمدرد اور عکسار اہل بیت کسی کے ساتھ ہیں۔ اے لوگو! تم سب کو اللہ میری طرف سے جزائے خیر دے۔ میں سمجھتا ہوں کل میرا ان کا فیصلہ ہو جائیگا غور و فکر کے بعد میری رائے یہ ہے کہ تم سب خاموشی سے نکل جاؤ رات کا وقت ہے، میرے اہل بیت کا ہاتھ پکڑو۔ اور تار کی میں اوجھر اوجھر چلے جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں، میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ یہ لوگ صرف مجھے پابند ہیں۔ میری جان لے کر تم سے فائل ہو جائیں گے۔

یہ سن کر آپ کے اہل بیت بہت رنجیدہ اور سیدھے ہوئے اور حضرت عباس نے کہا۔ یہ کیوں؟ کیا اس لئے کہ ہم آپ کے بعد زندہ ہیں۔ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے۔

حضرت سے زید بن عقیل کے رشتہ داروں سے کہہ دیا کہ اسے اور اہل عقیل! مسلم کا شعل کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں باز ستا دیدی۔

وہ کہنے لگے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ یہی کہیں گے کہ ہم اپنے شیخ
 معر دار اور عتر اددوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ ہم نے ان کے ساتھ نہ
 کوئی پتہ نہ کیا۔ نہ پتہ چلایا نہ تلوار چلائی۔ نہیں! واللہ یہ ہرگز نہ ہو گا
 ہم تو آپ پر جان مال، آل اولاد سب کچھ قربان کر دیں گے۔ آپ
 کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ جو آپ پر گزرے گی۔ وہی ہم پر گزرے
 گی۔ آپ کے بعد خدا ہمیں زندہ نہ رکھے۔

آپ کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔ مسلم بن عوفہ اسدی نے کہا
 ہم آپ کو چھوڑ دیں گے؟ حالانکہ آپ کا حق ادا نہیں
 کر کے ہیں۔ واللہ نہیں! ہرگز نہیں۔ میں اپنا پتہ و دشمنوں کے سینے میں
 توڑوں گا۔ جب تک قبضہ ہاتھ میں رہے گا۔ تلوار چلاتا رہوں گا۔ نہ ہتا ہو
 جاؤں گا تو پتھر پھینکیوں گا۔ یہاں تک کہ موت میرا خاتمہ کر دے۔

سعد بن عبداللہ الحنفی نے کہا۔ واللہ ہم آپ کو اس وقت تک
 نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک خدا جان نہ لے کہ ہم نے رسول اللہ کا
 حق محفوظ رکھا۔ واللہ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہو جاؤں گا۔ جلا دیا
 جاؤں گا۔ آگ میں بھونکا جاؤں گا۔ پھر میری خاک ہو میں اڑا دی جائیگی
 اور ایک مرتبہ نہیں شہر مرتبہ چھوڑے گی یہی سلوک کیا جائے گا۔ پھر بھی میں
 آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی حمایت میں فنا
 ہو جاؤں گا۔

زبیر بن العقیں نے کہا۔ بخدا اگر میں ہزار مرتبہ بھی آرسے

چہر اجاڑوں گا۔ تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ خوشا نصیب اگر میرے
قتل سے آپ کی اور آپ کے اہل بیت کے ان نوہالیوں کی جانیں نجات
جائیں۔
داہن جویر کمال شرح نجات البلاغہ

حضرت زینب کی بے چینی اور آپ کا تو صمیم

حضرت زین العابدین سے روایت ہے کہ جس رات کی صبح میرے
والد شہید ہوئے ہیں۔ میں بیٹھا تھا۔ میری بھوپنی زینب میری
پیمار داری کر رہی تھیں۔ اچانک میرے والد نے خیمہ میں اپنے ہاتھوں
کو طلب کیا۔ اس وقت خیمہ میں ابوذر غفاریؓ کے غلام جوڑی تلوار صاف
کر رہے تھے۔ اور میرے والد شعر پڑھ رہے تھے۔

دا کے زمانہ۔ بائرا بڑا ہو۔ تو کیسا بے وفادار دوست ہے صبح

دشام تیرے (مخول)

دکتے مارے جاتے ہیں۔ زمانہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ کسی

سے عوض قبول نہیں کرتا

دا اور سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر زندہ موت

کی راہ پر چلا جا رہا ہے۔

تین چار مرتبہ آپ نے یہی شعر دہرایا۔ میرا دل بھرا آیا۔ آنکھیں

ڈبڈبائیں۔ مگر میں نے آنسو روک لئے۔ میں سمجھ گیا کہ مصیبت

ٹلنے والی نہیں۔ میری بھوپنی نے یہ شعر سننے سے بے وقار

ہو گئیں۔ بے اختیار دوڑتی ہوئی آئیں۔ اور شیون و فریاد کرنے لگیں۔

حضرت امام نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔ "اے بہن! یہ کیا حال ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس و شیطان کی بے صبریاں ہمارے ایمان و استقامت پر غالب آجائیں۔"

انہوں نے روئے ہوئے کہا "کیونکر اس حالت پر صبر کیا جائے کہ آپ اپنے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔"

آپ نے کہا، "میت کا ایسا ہی فیصلہ ہے۔"

اس پر ان کی بے قراریاں اور بڑھ گئیں۔ اور شدت غم سے بے حال ہو گئیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ نے ایک طولانی تقریر صبر و اقامت پر فرمائی آپ نے کہا: "بہن خدا سے ڈرنا خدا کی تعزیت سے نشتی حاصل کر۔ موت دنیا میں ہر زندگی کے لئے ہے۔ آسمان والے بھی ہمیشہ جیتتے رہیں گے۔ ہر چیز فنا ہو بیواری ہے۔ پھر موت کے خیال سے اس قدر رنج و بے قراری کیوں ہو۔ دیکھو ہمارے لئے۔ اور ہر مسلمان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے یہ نمونہ ہیں کیا سکھانا ہے۔؟ ہمیں ہر حال میں صبر و ثبات اور توکل و رضا کی تعلیم دینا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی حال میں بھی اس سے مشرف نہ ہوں۔"

و تعقیدی دابن حبریرا

پوری رات آپ
 پوری رات عبادت میں گزار دی نے اور آپ کے
 ساتھیوں نے نماز، استغفار، اور دعا و تضرع میں گزار دی۔ راوی
 کہتا ہے کہ دشمن کے سوار رات بھر ہائے لشکر کے گرد چکر لگاتے رہے
 حضرت حسینؑ بلند آواز سے یہ آیت پڑھ رہے تھے۔

الْحَسْبُ الْكَافِرِ الَّذِي كَفَرْنَا نَسْتَعِينُ لَكُمْ خَيْرًا لَّا نَفْسُكُمْ اَنَا
 نَسْتَعِينُ لَكُمْ لِيَزِدَّادُوا اِثْمًا لَكُمْ عَذَابُ مَعِينٍ مَا كَانَ اللهُ
 لِيُذْرِيَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا اَنْتُمْ حَتَّى يَمِيْزَ اَبْنِيَّةً مِنْ الطَّيِّبِ
 دشمن کے ایک سوار نے جب یہ آیت سنی۔ تو چلا کر کہنے
 لگا۔ "متم رب کعبہ کی۔ ہم ہی طیب ہیں۔ اور تم سے الگ کر دیئے
 گئے ہیں۔"

جمعہ یا شنبہ کے دن دسویں محرم کو نماز فجر کے
 عشرہ کی صبح بعد عمر بن سعد اپنی فوج لے کر نکلا۔ حضرت
 حسینؑ نے بھی اپنے اصحاب کی صفیں قائم کیں۔ ان کے ساتھ حضرت

سے دشمن یہ خیال نہ کریں۔ کہ ہماری ڈھیل ان کے لئے بھلائی ہے۔ ہم صرف
 اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں۔ کہ ان کا تبرم اور زیادہ ہو جائے۔ خدا
 مؤمنین کو اسی حالت میں چھوڑ سکتے والا نہیں ہے۔ وہ پاک کو ناپاک سے
 الگ کر دے گا۔

تیس سوار اور چالیس پیدل کل بہتر آدمی تھے۔ مہینہ پرزہ پیر بن
 یقین کو مقرر کیا۔ علم اپنے بھائی عباس بن علی کے ہاتھ میں دے دیا
 شیروں کے پیچھے خندق کھود کر اس میں بہت سا ایندھن ڈھیر
 کر دیا۔ اور آگ جلا دی تھی۔ تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ
 ہو سکے۔

شہر کی پادہ گوئی فوج سے شہر بن ذی الجوشن گھوڑا دوڑاتا
 ہوا نکلا۔ آپ کے لشکر کے گرد پھرا
 اور آگ دیکھ کر چلا گیا۔ "اے حسین! قیامت سے پہلے ہی تو نے
 آگ قبول کر لی۔"

حضرت نے جواب دیا۔ "اے چرواہے کے لڑکے! تو ہی آگ
 کا زیادہ مستحق ہے۔" مسلم بن عویض نے عرض کیا۔ "مجھے اجازت دیجئے
 اے پیر مار کر ہلاک کر ڈالوں۔ کیونکہ وہ بالکل زور پر ہے۔"
 حضرت نے منع کیا۔ "ہنیں! میں لڑائی میں پہل نہیں
 کروں گا۔"

دعیقوبی و ابن حبریر

دعا کیلئے ہاتھ اٹھائیے دشمن کا رسالہ آگے بڑھتے
 کے لئے ہاتھ اٹھاویئے۔ الہی ہر مصیبت میں تو ہی میرا بھروسہ
 ہے۔ ہر سختی میں میرا تو ہی پشت و پناہ ہے۔ کتنی مصیبتیں پڑیں،

ول مکرور ہو گیا۔ تدبیر نے جو اب دیدیا۔ دوست نے بے وفائی کی دشمن
 نے خوشیاں چاہیں۔ مگر میں نے صرف کھٹی سے التجا کی۔ اور تو نے ہی
 میری دستگیری کی! تو ہی ہر نعمت کا مالک ہے۔ تو ہی احسان والا
 ہے۔ آج بھی کھٹی سے التجا کی جاتی ہے۔"

(شرح پنج البلاغہ)

جب دشمن قریب آ گیا۔ تو آپ

دشمن کے سامنے خطبہ نے اڑھنی طلب کی سوار ہوئے۔
 قرآن سامنے رکھا۔ اور دشمن کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو کر بلند
 آواز سے خطبہ دیا۔

اے لوگو! میری بات سنو۔ جلدی نہ کرو، مجھے نصیحت کر لینے دو۔
 اپنا عذر بیان کرنے دو۔ اپنی آمد کی وجہ کہنے دو۔ اگر میرا عذر معقول
 ہو۔ اور تم اسے قبول کر سکو۔ اور میرے ساتھ انصاف کرو۔ تو یہ تمہارا
 لئے جو شکر نصیبی کا باعث ہوگا۔ اور تم میری مخالفت سے باز
 آ جاؤ گے۔ لیکن اگر سننے کے بعد بھی تم میرا عذر قبول نہ کرو۔ اور
 انصاف کرنے سے انکار کرو۔ تو پھر مجھے کسی راستے سے کھٹی انکار
 نہیں۔ تم اور تمہارے ساتھی ایک کر لو۔ مجھ پر ٹوٹا پڑو۔ مجھے ذرا بھی
 ہمت نہ دو۔ میرا اعتماد ہر حال میں مروت پروردگار عالم پر ہے۔ اور
 وہ سب کو کاروں کا عالمی ہے۔

آپ کی اہل بیت سے یہ کلام سننا۔ تو شدت تا شہادت سے بڑا نتیجہ

ہو گئیں۔ اور خیمہ سے آہ و بیکا کی صدا بلند ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی
عباس اور فرزند علی کو بھجا۔ تاکہ انھیں خاموش کرائیں۔ اور کہا "ابھی
انھیں بہت رونا ہائی ہے۔" پھر بے اختیار پکار اٹھے۔ خدا عباس
کی عمر وراثہ کرے۔ یعنی ابن عباس کی! راوی کہتا ہے کہ یہ جملہ
اس لئے آپ کی زبان سے نکل گیا۔ کہ مدینہ میں عبد اللہ ابن
عباس کے غورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا۔ مگر آپ نے
اس پر توجہ نہ کی تھی۔ اب ان کا بزرگ و فزع دیکھا۔ تو عبد اللہ ابن
عباس کی بات یاد آگئی۔ اور پھر آپ نے از سر نو تقریر شروع کی۔
"لوگو! میرا سب نسب یاد کرو۔ سوچو کہ میں کون ہوں۔؟ پھر
اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ خوب غور کرو
کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا۔ اور میری حرمت کا رشتہ ٹوٹنا روا
ہے۔ کیا میں تمہارے بنی کی لڑکی کا بیٹا۔ اس کے عمر ادکا بیٹا نہیں ہوں
کیا پیدا شہدا امیر حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا ذوالجناحین
صغیرؓ میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم نے رسول اللہؐ کا یہ مشہور قول نہیں
سنا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرمائے تھے۔ سید
اشحاب اہل الجنتہ (جنت میں نوجوروں کے سردار) اگر میرا یہ بیان
سچا ہے۔ اور ضرور سچا ہے کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد
سے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ تو بتاؤ۔ کیا مجھیں برہنہ تلواروں
سے میرا استقبال کرنا چاہیے۔ اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے

تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے تصدیق کر سکتے ہو۔ جابر بن
 عبداللہ انصاری سے پوچھو۔ ابو سعید خدری سے پوچھو۔ مہلب بن سعد
 خدری سے پوچھو۔ زید بن ارقم سے پوچھو۔ انس بن مالک سے پوچھو وہ
 میں بتائیں گے کہ انھوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے
 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یا نہیں؟ کیا یہ بات بھی میرا خون
 ماننے سے نہیں روک سکتی؟ واللہ اس وقت روئے زمین پر بجز میرے
 کوئی اور ایسا موجود نہیں۔ میں تمہارے نبی کا بلا واسطہ بھائی ہوں
 تم اس لئے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ میں نے کسی کی جان لی ہے
 یا کا خون بہایا ہے؟ کسی کا مال چھینا ہے؟ کہو کیا بات ہے؟ آخر
 ہر قصور کیا ہے؟

آپ نے بار بار پوچھا، مگر کسی نے
 کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر آپ نے پڑے
 نام کے کہنے کے نام لے لے کر پکارنا شروع کیا۔ اسے
 بن رہی، اسے جواب دینا۔ اسے قیس بن الانصاری، اسے
 زید بن الحارثہ، کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھیل پکھا گئے
 زمین سرسبز ہو گئی۔ ہنریا ایل پڑیں۔ آپ اگر آپس گئے تو اپنی فوج
 جبار کے پاس آئیں گے۔ چلے آئیے؟
 اس پر ان لوگوں کی زبانیں کھلیں۔ اور انھوں نے کہا ہرگز نہیں
 ہم تو نہیں لکھا تھا۔

آپ چلا آئے۔ سبحان اللہ! یہ کیا جھوٹ ہے۔ واللہ
 نے لکھا تھا۔ اس کے بعد آپ نے پھر پکار کر کہا۔ اے لوگو! جو
 تم آپ جیسے ناپسند کرتے ہو۔ اس لئے بہتر نہیں ہے جیسے دو۔
 یہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔

سکر قیس بن الاشعث نے
 دولت منظور نہیں کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اپنے آپ
 اپنے عزاؤں کے حوالے کریں۔ وہ وہی برتاؤ کریں گے جو ان
 کو پسند ہے۔ آپ کو ان سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔
 آپ اتنے جواب دیا۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے پٹے
 اے شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ بنی ہاشم مجھ سے مسلم بن عقیل کے
 ایک اور خون کا بھی مطالبہ کریں؟ نہیں! وہ اللہ میں زلت کے
 اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔

داستان حبیر

یہ کہہ کر آپ نے اونٹنی بٹھا دی۔ عقبہ بن سمان کو حکم دیا
 اس کی کوچی باندھ دے۔ اور دیکھا کہ دشمن کے لشکر نے
 کی طرف حرکت شروع کر دی۔

نہیر بن القیس

نہیر کا کوفہ والوں سے خطاب اپنا گویا
 لشکر کے سامنے پہنچے اور چلائے۔ اسے اپنی کوفہ اعدا بیاہی

و ہر مسلمان پر اپنے بھائی کو نصیحت کرنا فرض ہے۔ دیکھو اس وقت
 ماہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی دین اور ایک ہی طریقہ ہے پر
 تم ہیں۔ جب تک تمہاری پیام سے باہر نہیں نکلتیں۔ تم ہمارے نصیحت
 پھر خواہی کے ہر طرح حقدار ہو۔ لیکن تلوار کے درمیان آئے ہی
 بھی حرمت ٹوٹ جائے گی۔ اور تم الگ دو گروہ ہو جاؤ گے
 جو خدا کے ہمارا اور تمہارا اپنے بنی کی اولاد کے باہر ہے ہر امتحان
 با جا ہے۔ ہم تمہیں اہل بیت کی نصرت کی طرف بلائے اور سر
 سید اللہ بن زیاد کی مخالفت پر دعوت دیتے ہیں۔ لیکن کرو ان
 کموں سے تمہیں کبھی بھلائی حاصل نہ ہو گی۔ یہ تمہاری آنکھیں
 ڈھکیں گے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔ تمہارے چہرے سے نگاریں
 گے۔ تمہیں درختوں کے تنوں پر پھانسی دیں گے۔ اور نیچے کاروں کو
 ن چن کر قتل کریں گے۔ بلکہ وہ تو کب کا کمر پکے ہیں۔ ابھی چہرے
 انہی بن عروہ وغیرہ کے، اعتسات استہ پر لسنے نہیں ہوئے ہیں
 کہ تمہیں یاد نہ رہے ہوں گے۔

کو پیوں سے یہ تقریب سستی تو زہیر کو برا بھلا کہنے لگے۔ اور ان
 زیاد کی تعریفیں کرنے لگے۔ پورا ماہ اس وقت تک نہیں گلیں گے
 پینے تک صاف اور ان کے ساتھ چھوٹی کو قتل نہ کریں۔ یا انہیں
 دو پرو حاضریہ کریں۔ یہ ان کا جواب تھا۔

زہیر نے جواب دیا: "خیر اگر سیر کا چھو کر دینا زیاد"

ناظم کے پیٹے سے کہیں زیادہ حمایت و نصرت کا مستحق ہے۔ تو کہ
ازکم اولاد رسول کا انتہا پاس کرو کہ لے سے قتل نہ کرو۔ لے اور ان
کے حکم زادیر پدین معاویہ کو چھوڑ دو۔ تاکہ آپس میں اپنا معاملہ طے
کر لیں۔ میں قسم نکھا کر کہتا ہوں۔ کہ یزید کو خوش کرنے کے لئے یہ
ضروری نہیں ہے کہ تم حسین کا خون بہاؤ۔

(ابن جریر و شرح بیح البلاغ)

حزین یزید کی موافقت
عبدی بن حرملا سے روایت ہے
کہ ابن سعد نے جب فوج کو حرم
وی۔ تو حرم بن یزید نے کہا۔ خدا آپ کو سنوارے کیا آپ اس
شخص سے واقعی لڑائی لڑیں گے۔

ابن سعد نے جواب دیا۔ ہاں واللہ لڑائی! ایسی لڑائی جس
میں کم از کم یہ ہو گا کہ سرکشیں گے۔ اور ہاتھ شانوں سے اڑ جائیں
گے۔ ہرنے کہا۔ بخدا! اگر مجھے اختیار ہوتا۔ تو ضرور منظور کر لیتا۔ مگر کیا
کروں تمہارا حاکم منظور نہیں کرتا۔
حزین یزید یہ سن کر اپنی جگہ بولٹ آیا۔ اس کے قریب خود اس
کے قبیلہ کا بھی ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا نام کرۃ بن عتیس تھا۔
نے اس سے کہا۔ تم نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا۔
بعد میں کرۃ کہا کرتا تھا۔ حرم کے اس سوال ہی سے میں سمجھ گیا تھا
کہ وہ لڑائی میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ اور مجھے ٹالنا چاہتا ہے۔

تاکہ اس کی شکایت حاکم سے نہ کریں۔ یہ کہہ کر کہ میں نے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔ میں دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ میرے الگ ہوتے ہی حرمے امام حسین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کیا۔

اس کے قیدیہ کے ایک شخص ہاجرین اوس نے کہا کہ کیا تم حسین پر حملہ کرنا چاہتے ہو۔ حرمے مویشی ہو گیا۔ ہاجر کو شک ہوا کہنے لگا۔

تمہاری خاموشی مشتبہ ہے۔ میں نے کبھی کسی جنگ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کوفہ میں سب سے بہادر کون ہے؟ تو تمہارے نام کے سوا کوئی نام میری زبان پر نہیں آسکتا۔ پھر تم یہ اس وقت کیا کر رہے ہو۔؟

حرمے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بچدایں جنت یا دوزخ کا انتخاب کر رہا ہوں۔ واللہ میں نے جنت کا انتخاب کر لیا ہے۔ چاہے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جائے یہ کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر لشکر حسین میں پہنچ گیا۔

حضرت حسین کی خدمت میں پہنچ کر کہا۔ ”ابن رسول اللہ! میں ہی وہ بے نیت ہوں جس نے آپ کو سٹنے سے روکا۔ راستہ بھر آپ کا پیچھا کیا۔ اور اس جگہ اترنے پر مجبور کیا۔ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں کبھی یہ بات نہ آئی۔ کہ یہ لوگ آپ کی شرطیں منظور نہیں کریں گے۔“

اور آپ کے معاملہ میں اس حد تک پہنچ جائیں گے۔ واللہ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایسا کریں گے۔ تو ہرگز اس حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ میں اپنے قصوروں پر نام ہو کر توبہ کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں آپ کے قدموں پر زبانون ہو جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ میری توبہ کے لئے کافی ہو گا۔“

حضرت نے شفقت سے فرمایا: ہاں! خدا تیری توبہ قبول کرے تجھے بخش دے، تیرا نام کیا ہے۔؟“
اس نے کہا: حشر بن یزید!“

فرمایا: ”تو حر د یعنی آزاد) ہی ہے۔ جیسا کہ تیری ماں نے تیرا نام رکھ دیا ہے۔ تو دنیا میں اور آخرت میں انشاء اللہ حر ہے۔“

پھر دشمن کی صفوں کے سامنے
کو پیڑوں سے حر کا خطاب پہنچا اور کہا: ”اے لوگو! حسین
کی پیش کی ہوئی شرطوں میں سے کوئی شرط کیوں منظور نہیں کر لیتے
تاکہ خدا تمہیں اس امتحان سے بچائے۔“

لوگوں نے جواب دیا: ”یہ ہمارے سرور عمر بن سعد موجود ہیں
جواب دیں گے۔“

عمر نے کہا: ”میری دلی خواہش تھی کہ ان کی شہر میں
منظور کر سکتا۔“

اس کے بعد حر نے نہایت جوش و خروش سے تفسیر کی

اور اہل کوفہ کو ان کی بد عہدگی و عذر پر شرم و بغیرت دلائی لیکن اس کے جواب میں انھوں نے تیر برس سانا شروع کر دیئے۔ ناچار خیمہ کی طرف لوٹ آیا۔

اس واقعہ کے بعد عمر بن سعد نے اپنی کمان جنگ کا آغاز اٹھا لشکر حسین کی طرف یہ کہہ کر تیر بھینکا۔

گواہ رہو۔ سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔ پھر تیر بازی شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد زیاد بن ابیہ اور عبید اللہ بن زیاد کے غلام

ستیا اور سالم میدان میں نکلے۔ اور مبارزت طلب کی۔ قیوم طریق جنگ میں مبارزت کا طریقہ یہ تھا کہ فریقین کے لشکر سے ایک

ایک جنگ آزمانگلتا۔ اور پھر دونوں باہم گیر پیکار کرتے۔ لشکر حسین سے حبیب بن مظاہر اور برید بن حضیر نکلے لگے۔ مگر حضرت حسین نے

انہیں منع کیا۔ عبید اللہ بن عمیر البکلی نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ بھئی اجازت دیجئے۔ یہ شخص اپنی بیوی کے ساتھ حضرت کی حمایت کے

لئے کوفہ سے چل کر آیا تھا۔ سیاہ رنگ، تن و منہ کشاوہ سینہ کھسا اپنے اسکی صورت دیکھ کر فرمایا۔ بیشک یہ ہر دو میدان ہے۔ اور اجازت

دی۔ عبید اللہ نے چند پہروں میں دونوں کو زیر کر کے قتل کر ڈالا۔ اس کی بیوی ام رہیب ہاتھ میں لائٹی لئے کھڑی تھی۔ اور جنگ کی طرف

دیتی تھی۔ پھر بیکار سے اس قدر جو سٹش آیا کہ میدان جنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ حضرت حسین نے یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے

کی طرف بڑھنے لگی۔ حضرت حسین نے یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے

فرمایا "اہل بیت کی طرف سے خدا تمہیں جزائے خیر دے لیکن عورتوں کے ذمہ لڑائی نہیں۔"

گھٹنے ٹیک کر نیرے سیدھے کر دیئے اس کے بعد
 میمنہ نے حملہ کیا۔ جب بالکل قریب پہنچ گئے تو حضرت کے رفقاء میں
 پر گھٹنے ٹیک کر گھڑے ہوئے اور نیرے سیدھے کر دیئے۔ نیروں کے ہنر پر
 گھوڑے بڑھ نہ سکے۔ اور لوٹنے لگے۔ حضرت کی فوج نے اس موقع سے
 فائدہ اٹھایا۔ اور تیر بار گرنی آدمی قتل اور زخمی کر دیئے۔

اب باقاعدہ جنگ جاری ہو گئی۔ طرفین سے ایک
 عام حملہ ایک دو دو جوان نکلتے تھے اور تلوار کے جوہر
 دکھاتے تھے۔ حضرت حسین کے طرفداروں کا پلہ بھاری تھا۔ جو
 سامنے آتا تھا۔ مارا جاتا تھا۔ میمنہ کے سپہ سالار عمرو بن الحجاج نے یہ حالت
 دیکھی تو پکار اٹھا: بیوقوفو! پہلے یہ جان لو کہ کن سے لڑ رہے ہو یہ
 لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ تم اسی طرح ایک ایک کر کے قتل
 ہوتے جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو یہ مٹھی بھر ہیں۔ انہیں پتھروں سے مارو
 عمر بن سعد نے یہ رائے پسند کی اور حکم دیا۔ کہ مبارزت موقوف کی
 جائے۔ اور عام حملہ شروع ہو، چنانچہ میمنہ آگے بڑھا۔ اور گشت
 دشمن شروع ہو گیا۔ ایک گھڑی بعد لڑائی رکی تو نظر آیا کہ حسینی
 فوج کے نامور بہادر مسلم عوسجہ خاک و خون میں پڑتے تھیں

حضرت حسینؑ دوڑ کر لاش پر پہنچے۔ ابھی سانس باقی تھی۔
 آہ پھر کر فرمایا: مسلم تجھ پر خدا کی رحمت منہ من قضی
 انخیر و منہد فیظہر و ما بد نو متید یلاہ مسلم بن عوسجہ
 اس جنگ میں آپ کی جانب سے پہلے شہید ہوئے۔

دین جبر و کامل

گھوڑے پیکار لگائے۔ بن ذی ابو شہن اس کا سپہ سالار
 تھا۔ حملہ بہت سخت تھا۔ مگر حسینیؑ میرے نے بڑی ہی بہادری کے
 مقابلہ کیا۔ اس بارہ میں صرف ۳۳ سوار تھے۔ جس طرح ٹوٹا پڑنے
 لگے۔ زمین اٹا جاتی تھیں۔ آخر طاقتور دشمن نے خمیوں کر لیا کہ
 کامیابی نا ممکن ہے۔ چنانچہ فوراً نئی کمک طلب کی۔ بہت سے سپاہی
 اور پانسویں انداز ہر دو کو پہنچ گئے۔ انھوں نے آتے ہی تیرہ سنانا
 شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر میں حسینیؑ نوح کے تمام گھوڑے پیکار ہو گئے
 اور سواروں کو پیدل جانا پڑا۔

ایو بیو بن مشرغ رو اپریٹا کرتا ہے کہ شہر
 حرم کی شہادت۔ بن یزید کا گھوڑا خود میں سے زخمی کیا تھا
 جس نے اسے پیروں سے پھینکی کر ڈالا۔ حرم بن یزید نے پیر کو دیکھ کر
 تلوایا تھا۔ لے بالکل شیریں معلوم ہوتے تھے۔ تلوار ہر طرف متحرک
 تھی۔ اور یہ شہزبان پر ہنسا۔

دگر تم نے میرا گھوڑا بیچارہ کر دیا، تو کیا ہوا؟
 میں شریف کا بیٹا ہوں، خود ناک شیر سے بھی
 زیادہ بہادر ہوں۔

خچے چلا دیئے لڑائی اپنی پوری ہولناکی سے جا رہی تھی۔ اب
 دوپہر ہو گئی، مگر کوئی فوج قلب حاصل نہ کر سکی
 وہ یہ تھی کہ حسینی فوج نے تمام خچے ایک جگہ جمع کر دیئے تھے، اور وہ
 صرف ایک ہی رخ سے حملہ کر سکتا تھا، عربین سے کہتے یہ دیکھا
 تھے اکھاڑ ڈالنے کے لئے آدمی بھیجے، حسینی فوج کے صرف
 چار پانچ آدمی یہاں مقابلہ کرنے کا فی ثابیت ہوئے، انہوں
 کی آڑ سے دشمن کے آدمی قتل کرنے لگے، جب یہ صورت بھی
 ناکامیاب رہی، تو عربین سے کہنے لگے، چلا ڈالنے کا حکم دیا۔
 پاہی آگے کر دوڑے، حسینی فوج نے یہ دیکھا، تو مضطرب ہوئی
 مگر حضرت حسینؑ نے فرمایا، کچھ پروا نہیں، جلاسنے دو، یہ ہمارے
 لئے اور بھی زیادہ بہتر ہے، اب وہ پیچھے سے حملہ نہیں کر سکیں گے
 اور ہوا بھی یہی۔

اہم دوپہر کا قتل اسی اثناء میں زبیر بن العقیل نے شہر پر
 زبردست حملہ کیا، اور اس کی فوج کے
 قدم اکھاڑ دیئے، مگر کب تک؟ ذرا دیر کے بعد پھر دشمن کا ہجوم ہو گیا
 اب حسینی لشکر کی بے بسی صاف ظاہر تھی، بہت سے لوگ قتل

ہو چکے تھے۔ کئی نامی سردار مارے جا چکے تھے۔ ختنہ کو بن عیسیٰ
 گنہی بھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ قتل ہو چکا تھا۔ اس کو پوری
 ام و ہب بھی شہید ہونے لگی تھی۔ یہ میدان جنگ میں اس وقت
 مشول شہر کے چہرے سے مٹی صاف کر رہی تھی۔ اور یہ کہتی
 جاتی تھی۔ دیکھئے بہت مبارک ہو۔
 شہر نے اسے دیکھا اور قتل کر ڈالا۔

و ابن جریر شرح بیح البلاغ
 الإثماء عمرو بن عبد اللہ مصنفہ
 گاہ پر سے نہیں گئی اپنی بے بسی کی حالت جو اس کی
 اور چاہ جین سے عرض کیا دشمن اسے بالکل قریب آگیا ہے اللہ
 آپ اس وقت تک قتل ہونے نہیں پائیں گے۔ چہیتا کہہ لیا
 قتل نہ ہو جاؤں۔ لیکن میری آرزو ہے کہ اسے ریب سے نماز
 پڑھ کر لوں۔ جس کا وقت قریب آگیا ہے۔
 یہ سن کر حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ دشمنوں سے کہو
 ہیں نماز کی ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ دشمنوں سے در خواست متا
 نہیں کی اور لڑائی جا رہی ہے۔

یہ وقت بہت سخت تھا
 جیسا کہ شہادت دشمن نے اپنی پوری طاقت
 لگا دی تھی۔ غرض یہ ہوا کہ مہینی پورے کے پورے صوبے میں ظاہر

یعنی قتل ہو گئے۔ گویا فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ جیب کے بعد ہی سر
بن پڑپہ کی بار ہی تھی۔ جوش سے یہ شعر پڑھتے ہوئے دشمن کی
صفوں میں گھس پڑے۔

وہیں نے قسم کھائی ہے کہ قتل نہیں ہوں گا جب تک
سر قتل نہ کر لوں۔ اور مروں گا اسی حالت میں مروں گا کہ
آگے بڑھ رہا ہوں گا۔

انہیں تلوار کی کاری ضربوں سے ماروں گا۔ نہ بھاگوں
گا۔ نہ دوڑوں گا۔

زہیر کی شہادت
چند لمحوں کی بات تھی۔ حشر زخموں
سے چھوڑ کر گری۔ اور جاں بحق
تسلیم ہو گئے۔ اب ظہر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ حضرت نے اپنے سب
ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دشمن کا دباؤ اور بھی
زیادہ ہو گیا۔ اس موقع پر آپ کے پیروں کے سپہ سالار زہیر
بن القین نے میدان اپنے ہاتھ لے لیا۔ اور شعر پڑھتے ہوئے
دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

وہیں زہیر ہوں۔ ابن القین ہوں۔ اپنی تلوار کی
لوک سے انہیں حین سے دور کر دوں گا۔
صفیں ویران کر ڈالیں۔ پھر لوٹے۔ اور حضرت حین کے شانے
پر ہاتھ مار کر جوش سے یہ شعر پڑھے

در بڑھ، خدا نے تجھے ہدایت دی۔ آج تو اپنے نانا
بنی سے ملاقات کرے گا۔

اور صن سے علی مرتضیٰ سے اور بہا اور جوان جعفر طیار
سے (اور شہید زندہ اسماء اللہ حمزہ سے)

پھر دشمن کی طرف لوٹے اور قتل کرتے رہے، یہاں
تک کہ قتل ہو گئے۔

اب آپ کے ساتھ
غفاری بھائیوں کی بہاوری نے دیکھا کہ دشمن کو روکا
ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ آپ کے سامنے ایک
کر کے قتل ہو جائیں۔ چنانچہ دو غفاری بھائی آگے بڑھے اور لڑنے لگے
پشیران کی زبان پر تھے۔

دینی غفار اور قبائل نزار نے اچھی طرح جان لیا
ہے؟ (کہ ہم بے پناہ شمشیر آب دار سے قاجروں
کے ٹکڑے اڑا دیں گے)

دائے قوم، تلواروں اور نیزوں سے شریفوں کی
حمایت کرو)

ان کے دو بہاوری لڑکے
جاہری لڑکوں کی فداکاری سامنے آئے۔ دونوں
بھائی تھے اور زار و قطار رو رہے تھے حضرت نے انہیں دیکھا تو فرمایا

لگے۔ اے میرے بھائی کے فرزند! کیوں روتے ہو۔ مجھے یقین ہے ابھی چند لمحے بعد تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

انہوں نے گریہ سے ٹوٹی ہوئی آوازیں عرض کیا۔ ہم اپنی جان پر نہیں روتے۔ ہم آپ پر روتے ہیں۔ دشمن نے آپ کو گھیر لیا ہے اور ہم آپ کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ پھر دونوں نے بڑی ہی شجاعت سے لڑنا شروع کیا۔ بار بار چلاتے تھے۔ السلام علیک یا ابن رسول اللہ!

آپ جواب دیتے تھے۔ "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے آخر دونوں شہید ہو گئے۔

ان کے بعد حضرت **خطلہ بن اسعد کی شہادت**

کھڑے ہوئے۔ اور بلند آواز میں دشمن سے مخاطب ہوئے "اے قوم میں ڈرنا ہوں عاد و ثمود کی طرح مہتیں بھی روز بد نہ دیکھنا پڑے۔ میں ڈرنا ہوں کہ تم بہ پاؤ نہ ہر جاؤ۔ اے قوم حسینؑ کو قتل نہ کرو۔ ایسا نہ ہو خدا تم پر عذاب نازل نہ کرے۔" بالآخر یہ بھی شہید ہو گئے۔

حضرت کے بعد دیگرے تمام اصحاب **علی اکبر کی شہادت** قتل ہو گئے۔ اب بنی ہاشم اور

خاندان نبوت کی باری تھی۔ سب سے پہلے آپ کے صاحبزادے علی اکبر میدان میں آئے اور دشمن پر حملہ کیا۔ ان کا رجز یہ تھا۔

دیں غلی بن حسین بن علی ہوں۔ قسم رپ کعبہ کی ہم بنی
کے قرب کے زیادہ حقدار ہیں)

قسم خدا کی، نامعلوم باپ کے لڑکے کا بیٹا ہم پر
حکومت نہیں کر سکے گا)

بڑی شجاعت سے لڑے آخر مرہ بن شقذ العبدی کی تلوار سے
شہید ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا خیمہ سے ایک
عورت تیزی سے نکلی۔ اتنی حسین تھی جیسے اٹھا ہوا سورج باد
چلا رہی تھی "آہ بھائی! آہ بھائی! میں نے پوچھا یہ کون ہے؟
لوگوں نے کہا "زیب بنت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن
حضرت حسین نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور خیمہ میں پہنچا آگے بچھ
غلی کی نعش اٹھائی اور پیچھے کے سامنے لاکر رکھ دی۔

داہن جو پر مشرق تہج السکطانی

ان کے بعد اہل بیت اور بنی ہاشم کے دوسرے
ایک جوان رعنا

میران میں ایک جوان رعنا عمروار ہوا۔ وہ کتر پپہ۔ تہہ بند یا تہہ بند
پاؤں میں نعل پہنے تھا۔ بائیں نعل کی ڈوری ٹرنی ہوئی تھی۔ وہ اس
ذکر حسین تھا کہ اس کا چہرہ چاند کا شکر اسمعلوم ہوا تھا۔ شیر کی
لڑت پھرتا ہوا آیا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ عمرو بن سعد اذوی نے اسی
کے سر پر تلوار مار دی۔ جوان چلا گیا۔ حاتم بن حجاب اور بن ہریرہ اذوی

سینے ہی حضرت حسینؑ بھوکے باز کی طرح ٹوٹے۔ اور غضبناک شیر کی طرح قاتل پر لپکے۔ بے پناہ تلوار کا وار کیا۔ قاتل سے ہاتھ اٹھا دیا مگر ہاتھ کہنی سے کٹ کر اڑ چکا تھا۔ زخم کھا کر قاتل نے پکارنا شروع کیا۔ فوج اسے بچانے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ مگر گھبراہٹ میں بچانے کے بجائے اسے روند ڈالا۔

راوی کہتا ہے "جب غبار چھٹ گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ حضرت حسینؑ لڑکے کے سر ہانے کھڑے ہیں۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اور آپؑ خرابے ہیں۔ ان کے لئے ہلاکت جنوں نے مجھے قتل کیا ہے۔ پچھتوں کے دن تیرے ثانا کو جواب دیں گے۔ بخدا تیرے چچا کے لئے یہ سخت

خیریت کا مقام ہے کہ تو اسے پکارے اور وہ جواب نہ دے۔ یا جواب دے۔ مگر اس کی آواز تجھے نفع نہ پہنچا سکے۔" افسوس تیرے چچا کے دشمن بہت ہو گئے۔ اور دوست باقی نہ رہے۔ پھر لاشیں اپنی گود میں اٹھالی۔ لڑکے کا سینہ آپ کے سینہ سے ہلا ہوا تھا۔ اور پاؤں زمین پر گر گئے ہیں۔ اس حال سے آپ اسے لائے۔ اور علی اکبر

کی لاش کے پہاویں لٹا دیا۔ راوی کہتا ہے "میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا "قاسم بن حسن بن علی بن ابی طالب"

حضرت حسینؑ پھر اپنی جگہ کھڑے ہو لو و تازہ کی شہادت ہو گئے۔ یقیناً اس وقت آپ کے یہاں لڑکا پینا ہوا۔ وہ آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے گود میں رکھا

در اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ اچانک ایک تیر آیا۔ اور بچے کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ بچے کی روح اسی وقت پرواز کر گئی آپ نے تیر اس کے حلق سے کھینچ لیا۔ خون سے چلو کھیرا اور اس سے جسم پر لٹنے اور فرمانے لگے۔ واللہ تو خدا کی نظر میں حضرت صالح کی اونٹنی سے زیادہ عزیز ہے۔ اور محمد خدا کی نظر میں صالح سے زیادہ افضل ہیں۔ ابی! اگر تو نے ہم سے اپنی نصرت روک لی ہے جس میں تیری بہتری ہے۔
 (ابو بکر داہن حبیب و غیرہ)

یہی ہاشم کے مشہور اور اہل بیت شہید ہو گئے۔ ان میں سے ذیل کے نام مورخین نے محفوظ رکھے ہیں۔ (۱) محمد بن ابی سعید بن عقیل (۲) عبداللہ بن مسلم بن عقیل (۳) عبداللہ بن عقیل (۴) عبدالرحمن بن عقیل (۵) جعفر بن عقیل (۶) محمد بن عبداللہ بن جعفر (۷) عون بن عبداللہ بن سینہ بن عباس بن علی (۸) شیبہ بن عبداللہ بن عثمان بن علی (۹) محمد بن علی (۱۰) ابو بکر بن علی (۱۱) ابو بکر بن الحسن بن عبداللہ بن الحسن (۱۲) قاسم بن اسد (۱۳) علی بن الحسین (۱۴) عبداللہ بن الحسین۔

اس کے بعد آپ خود آپ کی ایک ہفتے کی ہاروت ہاروت بار بار تھی۔ آپ میدان میں تھے۔ کڑے تھے۔ دشمن بلیغاً کہتے آتے تھے۔ گوار کرنے کی تھی۔

پڑتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس قتل کا گناہ دوسرے کے سر ڈالے۔ لیکن شمر بن ذالحوشن نے لوگوں کو برا بیچتے کرنا شروع کیا ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا گیا۔ اہل بیت کے پیچھے میں چند کم عمر لڑکے اور عورتیں لڑ رہی تھیں۔ اندر سے ایک لڑکے نے آپ کو اس طرح کھڑا دیکھا۔ تو جوش سے بخود ہو گیا۔ اور خمیہ کی لکڑی لے کر دوڑ پڑا۔ اور وہی کہتا ہے کہ اس کے کانوں پر دوڑ پڑے ہل رہے تھے یہ گھبرایا ہوا واہیں بائیں دیکھا چلا۔ حضرت زینب کی نظر پڑ گئی دوڑ کر گیا۔ حضرت حسین نے بھی دیکھ لیا۔ اور بہن سے کہا "روکے ہو آنے نہ پائے" مگر لڑکے نے زور کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور حضرت کے پہلو میں پہنچ گیا۔ عین اسی وقت حجر بن کعب نے آپ پر تلوار اٹھائی۔ لڑکے نے فریاد ڈالتا تھا "او حبیب امیرے چچا کو قتل کرے گا"۔ سنگول حملہ آور نے اپنی تلوار لڑکے پر چھوڑ دی۔ اس نے ہاتھ پڑوں ہاتھ رک گیا۔ ذرا اسی کھال لگی رہ گئی۔ بچہ تکلیف سے چلایا۔ حضرت نے اسے سینہ سے چٹا لیا۔ اور فرمایا "صبر کر اسے تو اب خداوندی کا دلچہ بنا۔ اللہ تعالیٰ تجھے بھی تیرے صلح بزرگوں تک پہنچا دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ علی ابن ابی طالب، حمزہؓ، جعفر اور حسن بن علیؓ تک۔"

اب آپ پر ہر طرف سے زور
حضرت حسین کی شجاعت شروع ہوا۔ آپ نے بھی تلوار
 چلانا شروع کی۔ پیدل فوج پر لڑ پڑے اور تن تہا اس کے قدم اکھاڑ

دیکھے۔ عبید اللہ بن عمار جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ یہ ثابت کرتا
 ہے کہ میں نے تیرے سے حضرت حسین پر حملہ کیا۔ اور ان کے بالکل
 قریب پہنچ گیا۔ اگر میں چاہتا تو قتل کر سکتا تھا۔ مگر یہ خیال کر کے
 ہمت گیا کہ یہ گناہ اپنے سر گھپوں لوں۔ میں نے دیکھا۔ دائیں بائیں
 ہر طرف سے ان پر حملے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ جس طرف مرتد ہوتے
 تھے۔ دشمن کو جنگا دیتے تھے۔ وہ اس وقت کرتے پہنے اور عمامہ
 باندھے تھے۔ واللہ میں نے کبھی کسی شکستہ دل کو جس کا گھر کا گھر
 خود اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا ہو۔ ایسا شجاع، ثابت قدم
 دشمن اور جرمی نہیں دیکھا۔ حالت یہ تھی کہ دائیں بائیں سے دشمن اس
 طرح بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جس طرح شیر کو دیکھ کر بکریاں بھاگ
 جاتی ہیں۔ دیر تک یہی حالت رہی۔ اسی اثنا میں آپ کی بہن
 زینب بنت فاطمہ و علیہا السلام (خمیسے باہر نکلیں۔ ان کے
 کانوں میں بالیاں پڑھی تھیں۔ وہ چلاتی تھیں۔ کاشش آسمان
 زمین پر ٹوٹا پڑے۔ یہ وہ موقع تھا۔ جبکہ عمر بن سعد حضرت حسین
 سے بالکل قریب ہو گیا تھا۔ حضرت زینب سے پکار کر کہا "اے نضر کیا
 ابو عبد اللہ تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل ہو چکا ہے۔" زینب نے
 پھیر لیا۔ مگر اس کے شمال اور دائرے میں پر انہوں کی لڑیاں پہنے لگیں۔
 آپ کے حلقے میں تیرے سے ہوا گیا ہے آپ کو سخت پیاں
 لڑائی کے دوران

لگی۔ آپ پانی پی پینے فرات کی طرف چلے۔ مگر دشمن کب چلنے دیتا تھا۔ اچانک ایک تیر آیا۔ اور آپ کے حلق میں پو پست ہو گیا۔ آپ نے تیر کھینچ لیا۔ پھر آپ نے ہاتھ منہ کی طرف اٹھائے۔ تو دونوں خون سے بھر گئے۔ آپ نے خون آسمان کی طرف اچھالا۔ اور فریاد کیا "اللہ میرا شکوہ بگھتی ہے۔" ویکھ تیرے رسول کے ذرا سے کیا پرتاؤ ہو رہا ہے؟

تو تیر بر سر بام آ کہ خوش تماشا نیست

شکر گو سر ز نش پھر آپ اپنے خیمے کی طرف لوٹنے لگے۔ شکر اور اس کے ساتھیوں نے یہاں بھی عرض کیا۔ حضرت نے شکوہ کیا کہ ان کی نیت خراب ہے۔ خیمہ لوٹ چاہتے ہیں۔ فرمایا۔ "اگر تم میں دین نہیں۔ اور تم روز آخر سے ڈرتے نہیں۔ تو کم از کم دنیاوی شرافت پر قائم رہو۔ میرے خیمہ کو اپنے جاہور اور اوباشوں سے محفوظ رکھو۔"

شکر نے جواب دیا۔ "اچھا ایسا ہی کیا جائے گا۔ اور آپ کا شکر محفوظ رہے گا۔"

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ دشمن آخری تیر بھی اگر چاہتا۔ تو آپ کو بہت پہلے قتل کر ڈالتا۔ گناہ کوئی بھی اپنے سر لینے کو تیار نہ تھا۔ آخر شکر بن ابو سن چلایا۔ تمہارا برا ہو کیا انتظار کرتے ہو۔ کیوں کام تمام نہیں کرتے؟

اب پھر ہر طرف سے نرغہ ہوا۔ آپ نے پکار کر کہا "کیوں میرے قتل پر ایک دوسرے کو اچھارتے ہو؟ واللہ میرے بعد کسی بندے کے قتل پر بھی خدا اتنا ناخوش نہ ہوگا۔ جتنا میرے قتل پر ناخوش ہوگا۔" مگر اب وقت اچکا کھٹا۔ زر بن شریک بنتی سے **شہادت** آپ کے بائیں ہاتھ کو زخمی کیا۔ پھر شاہ نے پر تلوار ماری آپ کو زوری سے لٹکھڑا گئے۔ لوگ ہیبت سے پیچھے ہٹے۔ مگر سخنان بن انس بخفی نے بڑھ کر نیر ہارا۔ اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس نے ایک شخص سے کہا "سر کاٹ لے" وہ سر کاٹنے کے لئے لپکا۔ مگر جرات نہ ہوئی۔ سخنان بن انس نے وائنت پس کر کہا۔ خدا تیرے ہاتھ شل کر ڈالے! پھر پشش سے اڑا۔ آپ کو ذبح کیا۔ اور سر تن سے جدا کر دیا۔

جنر بن محمد غسانی سے مروی ہے کہ قتل کے بعد دیکھا گیا کہ آپ کے جسم پر نیر کے ۳۳ زخم اور تلوار کے ۳۴ گھاؤ تھے۔

قاتل سخنان بن انس قاتل کے واقع میں کسی قدر فتور تھا قتل کے وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ جو شخص بھی حضرت کی نعش کے قریب آتا تھا۔ وہ اس پر حملہ آور ہوتا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کوئی دوسرا ان کا سر نہ کاٹ لے۔ قاتل نے سر کاٹ کر خولی بن یزید اسٹیجی کے حوالے کیا۔ اور خود سر بن سعد کے پاس دھڑا لیا۔ اور پیچھے کے سامنے کھڑا ہو کر چلا یا۔

دیکھے سوئے چاندی سے لا دو۔ میں نے بڑا پاؤ شاہ
 مارا ہے)

وہیں نے اس کو قتل کیا ہے۔ جس کے ماں باپ سب سے
 افضل ہیں۔ اور جو اپنے نسب میں سب سے اچھا ہے)

عمر بن سعد نے اسے اندر بلا لیا۔ اور بہت خفا ہو کر کہنے لگا
 واللہ تو بخیر ہے۔ پھر اپنی لکڑی سے اسے مار کر کہا۔ "پاگل ایسی
 بات کہتا ہے۔ جدا اگر عبید اللہ بن زیاد تھا تو تجھے ابھی مرداؤالتا

(ابن جریر)

قتل کے بعد کو پیوں نے آپ کے بدن
 لوٹ کھسوٹ کے کپڑے تک اتار لئے۔ پھر آپ کے جسم کی
 طرف بڑھے۔ زین العابدین بستر پر بیمار پڑے تھے۔ ستر اپنے چہرہ
 سپاہیوں کے ساتھ پہنچا اور کہنے لگا "اسے بھی کیوں نہ قتل کر ڈالیں"
 لیکن اس کے بعد ساتھیوں نے مخالفت کی اور کہا۔ "کیا بچوں کو
 بھی مار ڈالو گے۔؟"

اسی اثناء میں عمر بن سعد بھی آ گیا۔ اور حکم دیا۔ کوئی عورتوں کے
 چہرے نہ گھسے۔ اس بیمار کو کوئی نہ چھیڑے۔ جس کسی نے خیمہ کا اسیاب
 لوٹا ہو واپس کر دے۔"

زین العابدین نے یہ سن کر اپنی بیمار آواز سے کہا۔ عمر بن سعد خدا تجھے
 جزائے خیر دے۔ تیری زبان نے ہمیں بچا لیا۔

عمر بن سعد کو حکم تھا کہ حسینؑ کی نعش گھوڑوں
 نعش روڈ ڈالیں کی ٹاپوں سے روڈ ڈالے۔ اب اس کا وقت
 آیا۔ اس نے پکار کر کہا: "اس کام کے لئے کون تیار ہے؟" نعش
 آدمی تیار ہوئے۔ اور گھوڑے دوڑا کر جسم مبارک روڈ ڈالا۔

چوں بگڑو نظیرِ خونیں کنوین بہ شہر
 خلقے نغماں کند کہ اپی داد خواہ کسیت

اس جنگ میں حضرت حسین کے ۴۷ آدمی مارے گئے۔ اور کوئی
 نوج کے ۸۸ مقتول ہوئے۔ (ابن جریر۔ کامل۔ بیقوبی)

حضرت زینبؑ نے پاپال لاش دیکھی بن سعد نے
 میدان جنگ سے کوچ کیا۔ اہل بیت کے خالوں اور بچوں کو
 ساتھ لے کر کوثر روانہ ہو گیا۔

قرہ بن قیس (جو شاہد یعنی ہے) روایت کرتا ہے کہ ان عورتوں
 نے جب حضرت حسینؑ اور ان کے لڑکوں کی وعزیزوں کی پاپال لاشیں
 دیکھیں۔ تو ضبط نہ کر سکیں۔ اور آہ و فریاد کی صدا اٹھیں بلند ہو گئیں
 گھوڑا بے گراں کے قریب پہنچا۔ میں نے کبھی اتنی حسینؑ عورتیں نہیں
 دیکھی تھیں جیسے زینب بنت علیہا السلام کا یہ بین کسی طرح
 کسی نہیں بھولتا۔ اسے شہر تھے پر آسمان کے فرشتوں کا درود و سلام
 یہ دیکھ حسینؑ رگیان ہیں پڑا ہے۔ خاک و خون سے آلودہ ہے

تمام بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے تیری بیٹیاں قیدی ہیں۔ تیری اولاد
مقتول ہے۔ ہوا ان پر خاک ڈال رہی ہے۔ راوی کہتا ہے۔ دوست
و دشمن کوئی نہ تھا۔ جو ان کے بین سے روٹے نہ لگا ہوں۔

(ابن حبیب)

پھر تمام مقتولوں کے سر کاٹے گئے۔ کل ۱۲ سر تھے
۱۲ سر مگر بن ذبی الجوشن۔ قیس بن الاشعث، عمرو بن الحجاج
عمر بن قیس۔ یہ تمام سر عبید اللہ بن زیاد کے پاس گئے۔

حضرت کا سر ابن زیاد کیسے منے حمید بن مسلم جو خودی
حضرت حسین کا سر کوفہ میں لایا تھا) روایت کرتا ہے کہ حسین کا سر
ابن زیاد کے سامنے رکھا گیا۔ مجلس حاضرین سے لبریز تھی۔ ابن زیاد
کے ہاتھ میں چھری تھی۔ چھری آپ کے لبوں پر مارنے لگا۔
جب اس نے بار بار یہی حرکت کی۔ تو زید بن ارقم صحابی چلا
گئے "ان لبوں سے اپنی چھری ہٹا لے۔ قسم خدا کی میری ان دونوں
آنکھوں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ اپنے ہونٹ ان ہونٹوں پر رکھتے
تھے۔ اور ان کا پوسہ لیتے تھے" یہ کہہ کر وہ زار و قطار روٹے لگے۔

ابن زیاد حقا ہو گیا "خدا تیری آنکھوں کو لاسے۔ واللہ اگر تو پورے
ہو کر سٹیا گیا نہ ہوتا۔ تو ابھی تیری گردن مار دیتا۔"
زید بن ارقم یہ کہتے ہوئے مجلس سے چلے گئے "اے عرب کے

لوگو! آج کے بعد سے تم غلام ہو۔ تم نے ابن فاطمہ کو قتل کیا۔ ابن
مرجانہ یعنی عبید اللہ کو حاکم بنا یا۔ وہ تمہارے ٹیکہ انسان قتل
کرنا اور شریروں کو غلام بنانا ہے۔ تم نے وقت پسند کر لی۔ خدا انہیں
مارے جو وقت قبول کرتے ہیں۔

بعض روایات میں یہ واقعہ خود زبیر کی طرف منسوب ہے۔ مگر صحیح
یہی ہے کہ ابن زیاد نے پٹری مار دی تھی۔

راوی کہتا ہے کہ جب اہل

ابن زیاد اور حضرت زینب بیت کی خاتونیں اور بیٹے

عبید اللہ کے سامنے پہنچے۔ تو حضرت زینب نے جو ہنہا بیت حقیقہ لباس
پہنا ہوا تھا۔ وہ پہنچائی نہیں جاتی تھیں۔ ان کی کپڑوں میں انھیں اپنے پیچ
میں لے گئیں۔ عبید اللہ نے پوچھا "یہ کون بیٹھی ہے؟" انھوں نے کوئی
جواب نہیں دیا۔ میں مرتبہ یہی سوال کیا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔ ان کی
ایک کپڑے نے کہا۔ "یہ زینب بنت فاطمہ ہیں۔ عبید اللہ شامتت کی راہ
سے چلایا۔ اس خدا کی تماشش جس نے تم لوگوں کو رسوا اور ہلاک
کیا ہے۔ اور تمہارے نام کو سب سے لگایا۔"

اس پر حضرت زینب نے جواب دیا "ہزار ستائش اس خدا کے

لئے جس نے ہمیں محمد سے عزت بخشی۔ اور ہمیں پاک کیا۔ کہ جیسا کہ

کہا ہے۔ فاطمہ رسوا ہونے فاجروں کے نام کو سب سے لگتا ہے۔

ابن زیاد نے کہا، تو نے دیکھا۔ خدا نے میرے فائدہ لیا۔

کیا سوک گیا

حضرت زینب بولیں ان کی نعمت میں قتل کی موت لکھی تھی
اس لئے وہ قتل میں پہنچ گئے فقیریب خدا انہیں اور تجھے ایک
جمع کروے گا اور تم باہم اس کے حضور سوال و جواب کر لو گے

ابن زیاد غضبناک ہوا اس کا غصہ دیکھ کر عمرو بن حرب نے
کہا "خدا امیر کو سزا دے۔ یہ تو شخص ایک عورت ہے۔ عورتوں
کی بات کا خیال نہ کرنا چاہیے"

پھر کچھ دیر بعد ابن زیاد نے کہا "خدا نے میرے سرش مر دار اور
میرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا
کر دیا" اس پر حضرت زینب نے تین سینچاں لے لیں بے اختیار
روپڑیاں انہوں نے کہا "واللہ تو نے میرے سر دار کو قتل کر ڈالا میرا
خاندان مٹا ڈالا میری شاخیں کاٹ دیں میری جڑ اکھاڑ دی اگر اس
سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

ابن زیاد نے مسکرا کر کہا "یہ شجاعت ہے تیرا پاپ بھی شاعر
اور شجاع تھا"

زینب نے کہا "عورت کو شجاعت سے کیا سروکار میری مصیبت
نے مجھے شجاعت سے نائل کر دیا ہے میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یہ
تو دل کی آگ ہے"

اس گفتگو سے فارغ
 ابن زیاد اور امام زین العابدین ہو کر ابن زیاد کی نظر
 زین العابدین علی بن الحسین پر پڑی۔ یہ بیمار تھے۔ ابن زیاد نے ان سے
 ان کا نام پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ علی بن الحسین: ابن زیاد نے ان
 سے کہا کہ اللہ نے علی بن الحسین کو قتل نہیں کر ڈالا۔

زین العابدین نے کوئی جواب نہیں دیا
 ابن زیاد نے کہا۔ "پولت کیوں نہیں؟"
 انہوں نے جواب دیا۔ میرے ایک اور بھائی کا نام بھی علی تھا
 لوگوں نے غلطی سے انھیں مار ڈالا۔

ابن زیاد نے کہا "لوگوں نے نہیں خدا نے مارا ہے"
 اس پر زین العابدین نے یہ آیت پڑھی (اللہ پتو فی
 اکا نفس حین موتہا ما کان لنفس ان تموت الا باذن
 اللہ -)

اس پر ابن زیاد چلا "خدا اپنے مارے۔ تو بھی انھیں مارے
 ہے: اس پر ابن زیاد نے چاہا انھیں بھی قتل کر ڈالے۔ لیکن وہ
 پتھر اڑھو کہ پیچ انھیں میں پیچھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر تو مرنا
 ہے۔ اور اس لڑکے کو ضروری قتل کرنا چاہتا ہے۔ تو میری اسی
 کے ساتھ مار ڈال۔"

امام زین العابدین نے بلند آواز سے کہا۔ "اے ابن زیاد اگر تو

ان عورتوں سے ذرا بھی رشتہ بچتا ہے تو میرے بعد ان کے ساتھ کسی متقی آدمی کو بچھینا جو اسلامی معاشرت کے اصول پر ان سے بڑاؤ کرے۔ ابن زیاد نے تک حضرت زینب کو دیکھتا رہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ رشتہ بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ واللہ مجھے یقین ہے کہ بچے دل سے لڑکے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے۔ اچھا لڑکے کو چھوڑ دو یہ بھی اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ جائے۔

(ابن جریر و کامل)

ابن عقیف کا قتل اس واقعہ کے بعد ابن زیاد نے جامع مدینہ میں مسجدیں شہر والوں کو جمع کیا۔ اور خطبہ دیتے ہوئے اس خدا کی تعریف کی جس نے حق کو ظاہر کیا۔ حق والوں کو تشیاب کیا۔ امیر المؤمنین زید بن معاویہ اور ان کی جماعت غالب ہوئی۔ کذاب ابن کذاب حسین بن علی اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ پھر عبداللہ بن عقیف اذہمی جو حضرت علی کے مشہور صحابی ہیں۔ اور جنگ جمل وصفیں میں زخمی ہو کر اپنی دونوں آنکھیں کھوپچے سے کھڑے ہو گئے۔ اور چلائے خدا کی قسم اسے ابن مروانہ۔ کذاب ابن کذاب تو ہے۔ نہ کہ حسین بن علی۔ ابن زیاد نے یہ سن کر انھیں قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد ابن زیاد نے حضرت حسین کا سر پھینک دیا۔ اس پر نصب کر کے زین بن قیس کے ہاتھ

یزید کے پاس بھجوا دیا۔ غازی بن ربیعہ کہتا ہے۔ جس وقت زحر بن شمس
 پہنچا۔ میں یزید کے پاس بھجواتھا۔ یزید نے اس سے کہا، کیا خبر ہے؟
 قاصد نے جواب دیا۔ فتح و نصرت کی بشارت لایا ہوں حسین
 بن علی اپنے اٹھارہ اہل بیت اور ساٹھ حمایتوں کے ساتھ پہنچے۔ ہم
 نے انھیں بڑھ کر روکا۔ اور مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں
 ورنہ لڑائی لڑیں۔ انھوں نے اطاعت پر لڑائی کو ترجیح دی۔ چنانچہ ہم
 نے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ان پر حملہ بول دیا۔ جب تلواریں ان
 کے سروں پر پڑنے لگیں۔ تو اس طرح ہر طرف بھاگنے اور بھاڑ پھولوں اور
 لکھو لیا ہیں چھیننے لگے۔ جس طرح کبوتر باز سے بھاگتے اور پھرتے ہیں
 پھر ہم نے ان سب کا قلع قمع کر دیا۔ اس وقت ان کے رشتہ دار غبار سے
 بے ہوش ہو رہے ہیں۔ ان کے جسم وھو پ کی شدت اور ہوا کی تیزی سے
 خشک ہو رہے ہیں۔ گدھوں کی خوراک بن گئے ہیں۔

راوی کہتا ہے یزید نے یہ سنا تو انہوں نے انھیں
 لکھو پھولوں سے لگا کر اشکبار ہو گئیں۔ کہنے لگا، پھر قتل حسین
 کے بھی ہیں تمہاری اطاعت سے خوش ہو سکتا تھا۔ ایسا یہ
 روئے ابن زیاد پر خدا کی لعنت! واللہ اگر میں وہاں ہوتا تو حسین
 سے ضرور راز گزر کر جاتا۔ خدا حسین کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے
 گا۔ یزید نے کوئی انعام نہیں دیا۔

(ابن جریر قال۔ تاریخ کبریٰ سنہ ۶۱)

یزید کے غلام قاسم بن عبد الرحمن سے روایت ہے کہ جب حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کے سر یزید کے سامنے رکھے گئے تو اس نے یہ شعر پڑھا۔
 دتلوار ہیں ایسوں کے سر بچھاڑتی ہیں جو ہمیں یزید ہیں۔
 حالانکہ دراصل وہی حق فراموش کر نپوالے ظالم تھے۔

پھر کہا: "واللہ اے حسین اگر میں وہاں ہوتا تو مجھے ہرگز قتل نہ کرتا۔"

یزید اور امام زین العابدین سر داروں کو اپنی مجلس میں بلایا۔ اہل بیت کو بھی بٹایا۔ اور امام زین العابدین سے مخاطب ہوا۔ اے علی! تمہارے ہی باپ نے میرا شہ کاٹا۔ میرا حق کھلایا۔ میری حکومت چھینا جا ہی۔ اس پر خدا نے اس کے ساتھ کیا جو تم دیکھ چکے ہو۔

امام زین العابدین نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی
 ما اصاب من مصیبت فی الارض وکافی انفسکم
 الا فی کتاب من قبل ان نبرائھا ان ذلک
 علی اللہ یسیر۔ لکیلا تا سور علی ما فانکم
 وکاتفرو حیوا تا کور ان اللہ لا یحب کل

ہفتالی فخر

یہ جواب یزید کو ناگوار گنوا۔ اس نے جاہا کہ لپیٹ پیٹے خالد سے
جواب دلو اسے۔ مگر خالد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تمہیں یزید سے خالد
سے کہا۔ کہتا کیوں نہیں۔ ما اصحابہ من مصیبت تیسرہ ما کیت
ایڈ کمر و عیون کثیر

پھر یزید دوسرے بچوں اور عورتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ انہیں اپنے
قریب بلا کر بچایا۔ ان کی ہمیت خراب ہوا ہی تھی۔ وہ کچھ کرتا سنت
ہوا اور کہنے لگا۔ خدا ابن مرجانہ کا پڑا کرے۔ اگر تم اس سے اس سے
رشتہ ہوتا۔ تو تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتا۔ نہ اس حال سے کہتے
سیرے پاس بچیا

حضرت (نام لکھا) نے
حضرت زینب کی بیجا کارہ گفتگو
کہ جب ہم یزید کے سر سے جھانکے گئے تو اس نے ہم پر ہرگز نظر نہ کیا

کہ تمہاری کوئی مصیبت نہیں ہو رہی ہے۔ لکن نہ کوئی ہو۔ یہ خدا کی قسم ہے کہ
آسمان سب سے پہ اس سے لڑے کہ بقا ان پر انہوں نے نہ کرو۔ اور خدا پر شکر ہے کہ
خدا مژدوں اور خیر کر نیوالوں کو ناپسند کرتا ہے
کہ جو مصیبت کوئی آتی ہے۔ خود تمہارے بارے میں انہوں نے آتے ہیں۔ اور
فلانی یا تو خدا تعالیٰ کو دیکھتے۔

ہیں کچھ دینے کا حکم دیا بڑی ہربانی سے پیش آیا۔ اسی اشارے میں ایک
سرخ رنگ کا شامی کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ امیر المؤمنین! یہ لڑکی مجھے
غناہت کر دیجئے۔ اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت میں کہیں اور
خوبصورت تھی۔ میں خوف سے کانپنے لگی۔ اور اپنی بہن زینب کی چادر
پکڑ لی۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں۔ زیادہ مجھدار تھیں۔ جانتی تھیں کہ یہ
بات نہیں ہو سکتی انھوں نے پکار کر کہا۔ تو کہتے ہیں نہ مجھے اس کا
اختیار ہے اور نہ اسے دینے کو اس کا حق ہے۔

اس جرات پر زینب کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا۔ تو جھوٹا بھتی ہے۔ واللہ
مجھے یہ حق حاصل ہے۔ اگر چاہوں تو ابھی کر سکتا ہوں۔

زینب نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ خود اس نے تمہیں یہ حق ہرگز نہیں دیا
یہ وہ ساری بات ہے کہ تم ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔ اور ہمارا دین
چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرو۔

بڑھپلا اور بھی زیادہ خفا ہو کر کہنے لگا۔ "دین سے تیرا باپ اور
تیرا بھائی نکل چکا ہے۔"

زینب نے بلا تامل جواب دیا۔ "اللہ کے دین سے میرے باپ
کے دین سے۔ میرے بھائی کے دین سے۔ میرے نانا کے دین سے تو
تیرے باپ سے تیرے نانا سے اور اس نے ہر ایک پائی ہے۔"

بڑھپلا ہلا آیا۔ "اسے دشمن خدا تو چھوٹی ہے۔"

زینب بولیں۔ "تو زبردستی حاکم بن بیٹھا ہے۔ ظلم سے گالیاں

بتا ہے۔ اپنی قوت سے مخلوق کو دبانا ہے۔
 حضرت فاطمہ بنت علی کہتی ہیں۔ یہ گفتگو سن کر شاید یزید شرمندہ
 ہو گیا۔ کیونکہ پھر کچھ نہ بولا۔ مگر وہ شامی پھر کھڑا ہوا۔ اور وہی بات کہی
 میں پر یزید نے غضبناک آواز میں اسے ڈانٹ بتائی۔ ”وہ ہو کھنٹ
 رہا تجھے موت کا تحفہ بنتے۔“

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر یزید شامی رواسا
 یزید کا مشورہ۔ اور امرار کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ان
 لوگوں کے ہائے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔ بعضوں نے سخت کٹائی کے
 ساتھ بد سلوکی کا مشورہ دیا۔ مگر نعان پشیر نے کہا۔ ”ان کے ساتھ وہی کہی
 ہو رسول اللہ انھیں اس حال میں دیکھ کر کرتے۔“

حضرت فاطمہ بن حسین نے یہ سن کر کہا۔ ”اسے یزید اب رسول
 اللہ کی لڑکیاں ہیں۔“

اس نسبت کے ذکر سے یزید کی طبیعت بھی متاثر ہو گئی۔ وہ اور
 درباری اپنے آنسو نہ روک سکے۔ بالآخر یزید نے حکم دیا کہ ان کے قیام
 کے لئے چلوڑہ انتظام کرو یا جائے۔“

اس اشتہار میں واقعہ کی خبر یزید کے
 یزید کی ہوشی کا حکم میں خودوں کو بھی معلوم ہو گئی۔ منہ منہ
 عبد اللہ یزید کی سوہی نے منہ پر لٹا بچا ڈالا۔ اور یا ہرا کر یزید سے کہا۔
 المؤمنین کیا حسین بن فاطمہ بنت رسول کا سراپا ہے۔“

یزید نے کہا: ہاں! تم خوب رو۔ بین کرو۔ رسول اللہ کے نواسے
اور قریش کے اصیل پر ماتم کرو۔ ابن زیاد نے جلدی کی قتل
کر ڈالا۔ خدا سے بھی قتل کر کے:

حسینؑ کی اجتہاد کی غلطی اس کے یزید نے حاضرین
جلس سے کہا: "تم جانتے ہو یہ

سب کس کا نتیجہ ہے؟ یہ حسین کے اجتہاد کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے
سوچا۔ میرے باپ یزید کے باپ سے افضل ہیں۔ میری ماں یزید کی ماں
سے افضل ہے۔ میرے نانا یزید کے نانا سے افضل ہیں۔ اور میں خود بھی
یزید سے افضل ہوں۔ اس لئے حکومت کا بھی یزید سے زیادہ مستحق
ہوں۔ حالانکہ ان کا یہ سمجھنا کہ ان کے والد میرے والد سے افضل تھے

صحیح نہیں۔ علی اور معاویہ نے باہم ٹھیکہ کیا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا
کہ کس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ رہا ان کا یہ کہنا کہ ان کی ماں میری ماں
سے افضل تھی تو بلاشبہ یہ ٹھیک ہے۔ فاطمہ بنت رسول اللہ میری ماں
سے کہیں افضل ہیں۔ اسی طرح ان کے نانا میرے نانا سے افضل تھے
تو خدا کی قسم کوئی بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا رسول اللہ
سے افضل بلکہ رسول اللہ کے برابر کسی انسان کو نہیں سمجھ سکتا
جسوں کے اجتہاد سے غلطی کی۔ وہ یہ آیت بالکل بھول گئے۔

اللہم ما لک الملک تو فی الملک من تشاء وتنزع الملک من
تشاء وتنزع من تشاء وتنزل من تشاء یبدل الخیرات

علیٰ کل مشیٰ قدا یر

پھر اہل بیت کی خواتین یزید کے محل میں پہنچائی گئیں۔ خاندان
معاویہ کی عورتوں نے انھیں اس حال میں دیکھا۔ تو بے اختیار
رونے پینے لگیں۔

یزید کی سستی تلافی
پھر یزید آیا۔ تو فاطمہ بنت حسین نے
اس سے کہا۔ "اے کیا رسول اللہ کی
لڑکیاں کیتریں ہو گئیں؟"

یزید نے جواب دیا۔ "اے میرے بھائی کی بیٹی ایسا کیوں ہونے
لگا۔؟"

فاطمہ نے کہا "بخدا ہمارے کان میں ایک بھی بالی نہیں
چھوڑی گئی۔"

یزید نے کہا تم لوگوں کا جتنا گیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہیں
مہتیں دوں گا۔ جس نے اپنا جتنا نقصان بتایا۔ اس سے دوگنا
تنگنا دیدیا گیا۔

یزید کا دستور تھا کہ روز صبح شام کے کھانے میں علی بن حسین
کو اپنے ساتھ شریک کیا کرتا۔ ایک دن حضرت حسن کے کسین بچے عمر ذکر
بھی بلایا۔ اور سنہسی سے کہنے لگا "تو اس سے لڑے گا۔؟" اور اپنے
لڑکے خالد کی طرف اشارہ کیا۔ عمرو بن حسن نے اپنے بچنے کے بھروسے
پن سے جواب دیا۔ یوں نہیں ایک پھری ٹپے دو اور ایک چھری اسے

پھر ہماری لڑائی دیکھو۔

یزید کھکھلا کر منہس پڑا۔ اور عمرو بن حسین کو گود میں اکھٹا کر
 سینے سے لگا لیا اور کہا "سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوا
 کرتا ہے۔"

یزید کی زور و چوہ پیمانی
 یزید نے اہل بیت کو کچھ دن اپنا
 جہان رکھا۔ اپنی مجلسوں میں ان
 کا ذکر کرتا۔ اور بار بار کہتا۔ "کیا ہرج تھا۔ اگر میں خود تھوڑی سی تکلیف
 گوارہ کر لیتا۔ حسین کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھتا۔ ان کے مطا
 پر غور کرتا۔ اگرچہ اس سے میری قوت میں کمی ہی کیوں نہ ہو جاتی۔ لیکن
 اس سے رسول اللہ صلعم کے حق اور رشتہ داروں کی تو حفاظت
 ہوتی۔ خدا کی لعنت! ابن مرجانہ (یعنی ابن زیاد) پر حسین کو
 جس نے لڑائی پر مجبور کیا۔ حسین نے کہا تھا۔ میرے ہاتھ میں اپنا
 ہاتھ زیدیں گے یا مسلمانوں کی سرحد پر جا کر جہاد میں مصروف
 ہو جائیں گے۔ مگر ابن زیاد نے ان کی کوئی بات بھی نہیں مانی۔ اور
 قتل کر دیا۔ ان کے قتل سے تمام مسلمانوں میں مجھے مبغوض بنا دیا
 خدا کی لعنت ابن مرجانہ پر! خدا کا غضب ابن مرجانہ پر!

اہل بیت کو رخصت کرنا
 جب اہل بیت کو مدینہ بھیجے
 لگا۔ تو امام زین العابدین
 سے ایک مرتبہ اور کہا "ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت! واللہ اگر میں حسین

کے ساتھ ہوتا۔ اور وہ میرے سامنے اپنی کوئی شرط بھی پیش کرتے تو میں اسے ضرور منظور کر لیتا۔ میں ان کی جان ہر منہ کن ذریعہ سے بچاتا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں خود میرے کسی بیٹے کی جان چلی جاتی۔ لیکن خدا کو وہی منظور تھا جو ہو چکا دیکھو۔ مجھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہنا جو ضرورت پیش آئے مجھے خبر دینا۔

بعد میں حضرت سکینہ پر اپرا کہا کرتی تھیں۔ میں نے کبھی کوئی ناما شکر انسان بزیڈ سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والا نہیں دیکھا۔

اہل بیت کی فاضلی بزیڈ نے اہل بیت کو اپنے ایک معتبر آدمی اور فوج کی حفاظت پر رخصت کر دیا۔ اس شخص نے راستہ بھر ان مصیبت زدوں سے اچھا برتاؤ کیا۔ جب یہ منزل متصور پر پہنچ گئے تو حضرت زینب بنت علی اور حضرت فاطمہ بنت حسین نے اپنی چوڑیاں اور گسنگن اسے بیچے اور کہا: یہ تمہاری نیکی کا بدلہ ہے۔ ہمارے کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

اس شخص نے زیور واپس کر دیئے اور کہلایا: واللہ میرا یہ برتاؤ کسی دنیاوی طمع سے نہ تھا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے تھا۔

دہریہ ہیں واکم اہل بیت کے آئے سے بہت پہلے دہریہ ہیں یہ

جائگہ غسل خیر پہنچ چکی تھی۔ بنی ہاشم کی خاتونوں نے سنا تو گھروں سے
چلائی ہوئی نیکل آئیں۔ حضرت عقبیل بن ابی طالب کی صاحبزادی
آگے آگے تھیں۔ اور یہ شعر پڑھتی جاتی تھیں۔

وکیا ہو گئے جب بنی تم سے سوال کریں گے کہ اے وہ جو
سب سے آخری امت ہو

تم نے میری اولاد اور خاندان سے میرے بعد کیا
سلوک کیا۔ کہ ان میں سے بعض قیدی ہیں اور بعض
خون میں نہاٹے پڑے ہیں۔

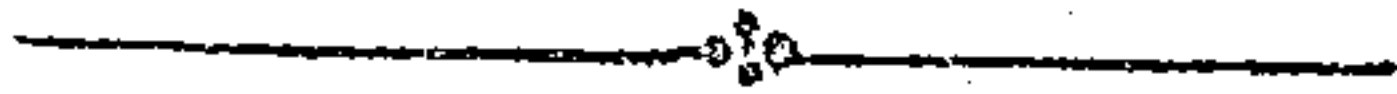
حضرت حسین کی شہادت پر بہت سے لوگوں
مشرقیہ نے مریشے کہے۔ سلیمان بن قیس کا مریشہ بہت
زیادہ مشہور ہوا۔

و میں خاندان محمد کے گھروں کی طرف سے گذرا مگر
وہ کبھی ایسے نہ تھے۔ جیسے اس دن جب ان کی حرکت
توڑی گئی۔

و خدا ان مکانوں اور مکینوں کو دور نہ کرے۔ اگرچہ
وہ اب اپنے مکینوں سے خالی پڑے ہیں۔
و گر بلا میں ہاشمی مقتول کے قتل نے مسلمانوں کی گردنیں
ذلیل کر ڈالیں۔

ان مقتولوں سے دنیا کی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر وہ

مصیبت بن گئے۔ اہ یہ مصیبت کتنی بڑی اور سخت ہو
 و کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین حسین کے فراق میں ہمیاء
 ہے اور دنیا کا غیب رہی ہے۔
 و آسمان بھی اس کی جدائی پر روتا ہے۔ ستارے
 بھی ماتم کرتے اور سلام بھیج رہے ہیں۔



افز
مولانا ابوالکلام آزاد

حادثہ کر بلا

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا۔ اور اشکبار آنکھوں سے پڑھا گیا ہے۔ لیکن اس درد انگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوہ ہائے حسرت مخفی تھے۔ جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہا لے گئے۔ اس لئے اب ہم کو قدیم زمانے کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقہ ماتم کا اضافہ کرنا چاہیے۔ اور خون آلود آنسوؤں کا جو چشمہ ہائے زخم رسیدہ دلوں سے ابل رہا تھا۔ اس کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر کے خود واقعہ شہادت کو اسرار شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریقہ ہوگا۔ اور شریعت نے امت محمدیہ

کو اسی طریق ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

دنیا میں سلاف

اسلاف پرستی کے غیر اسلامی طریقے

پرستی کا فطری

مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اسی بنا پر تمام قوموں نے اپنے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے منایا ہے۔ اور ان کے

اعمال کو آئندہ نسل کی عبرت و بصیرت کے لئے زندہ رکھنا چاہا ہے لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ وہ

وہی ہے۔ جس کی بنیاد دنیا کی بت پرستی نے رکھی۔ اور دراصل

اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اسی کو سمجھنا چاہیے

پہلی اس لئے کہ بسا اوقات انسانوں نے اسی راہ سے اصنام پرستی

کی منزل پائی اور آخری اس لئے کہ بت پرستی خود تو چلی گئی۔ مگر اپنا

نقش قدم اس شکل میں اب تک چھوڑ گئی ہے

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقہ کی طرف ہے جس کی

بنیاد پر شاہیر ملک اور قوم کے مجسمے (ایڈیٹورز) بنائے جاتے ہیں اور

ان کو اس لئے نصب کیا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ شاہیر

کی یاد دلائی جائے۔ اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت

ملے۔

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا۔ اور حضرت

نوح علیہ السلام کے زمانے تک اس قسم کے مجسمے قائم ہو چکے

تھے۔ اور ان کی علانیہ پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن یونان و مصر نے ان مجسموں پر تہن و تہذیب کا آب و رنگ پڑھا کر ان کو اور بھی شاندار و فریب بنا دیا۔ آج پورپ بائیان تہذیب و تمدن کے دیوتاؤں کی جو نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے۔ ان کے اندر یونان کی اس قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو صفیں نظر آتی ہیں، ان میں بھی اسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

لیکن اسلام ایک دن خالص تھا جو
اسلامی انقلاب توحید خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا
 اور انسانی عظمت کی ان تمام راہوں کا ہمیشہ کے لئے دروازہ
 بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو کسی حال میں بھی الہی عظمت کے نقطہ
 تک پہنچ سکتی تھیں۔ یا تزییب ہو سکتی تھیں۔ پس وہ کسی طریقہ
 بھی تمام مذکورہ بتائے سے عظمت کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا
 جس میں پرکھ دینا یا بار بھوک کھا چکی تھی۔

اسلام نے ٹٹا ہر جوئے ہی و نیاس کے تمام اعمال و عموال کو
 نظر ڈالی اور ہر عمل کی حقیقت و روح کو لے لیا۔ اور غیر ناسیہ
 موزوں جسم و لباس کو بچھڑا دیا۔

و شہ سے تین حقیقتوں کو تار یکپہریوں میں چھپا دیا تھا
 وہ دفعہ چاک چاک ہو گئے اور چہالست سے تین موزوں کو بچھڑا دیا

کے ڈھبیر میں گم کر دیا تھا۔ وہ ان سے الگ ہو کر دنیا کے
 دامن مراد میں گئے۔ غیر معتدل تمدن نے جن کھلی ہوئی بصیرتوں
 کو خوشنما چادروں کے آب و رنگ میں راز سر بستہ کی طرح مقفل
 کر دیا تھا۔ وہ بکسر فاش ہو گئے۔ اور حقیقت آفتاب کی طرح
 علانیہ بے نقاب ہو کر ہر انسان کو نظر آ گئی۔ قرآن حکیم نے اسی
 انقلاب کو ایک مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اللہ و علی الذین آمنوا و خدا مسلمانوں کا دوست اور

یخرجکم من الظلمات الی النور
 والذین کفرو اولیاءہم
 الطاغوت ینرجونہم
 من النور الی الظلمتہ
 (۱۲: ۲۵۸)

ساتھی جو ان کو ہر طرح کی انسانی تاریکیوں
 سے نکال کر فطرۃ صالحہ کی رہائی روشنی
 میں لانا ہے۔ مگر کفار کے دوست انہی
 طاغوت ہیں جو ان کو خدا کی بخشی ہوئی
 روشنی سے نکال کر جہل و ضلالت کی اندھیرا
 کی طرف لے جاتا ہے۔

پیام باوگار کا اسلامی طریقہ
 یہ ایک عظیم الشان انقلاب
 تھا جس کی جھلک
 اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے۔ اور مشاہیر پر قائم کرنے کا طریقہ
 بھی اس سے مستقیم نہیں۔ چنانچہ قدامت کی باوگار قائم کرنے اور ان کے
 اعمال و آثار کے زندہ رکھنے کا جو طریقہ نہ مانہ قدیم سے چلا آتا تھا
 اسلام نے اس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے

مسلمانوں کو عجموں کی شکل میں اسلام پرستی کی اجازت نہیں دی
 کیونکہ وہ بت پرستی تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اسلام زندہ انسانوں
 کے شرف کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا۔ مگر اس نے
 شاہیر کرام اور اسلاف صالحین کے نمونوں کے فوائدِ غلبہ کو
 بھی ضائع ہونے نہ دیا۔ اور ان کے اثر اس طرح ہی قائم کر دیا کہ
 ہر مومن کے آگے ان کی عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیئے اور
 کہا کہ دن میں جب پانچ بار خدا کے حضور آؤ۔ تو صراطِ مستقیم پر چلنے
 کی ہدایت مانگو۔ ساتھ ہی تشریح کر دی کہ صراطِ مستقیم انبیاء و
 شہداء اور صالحین کی راہِ علم و عمل ہے۔ اور اس لئے ان کے نمونے
 ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں۔

پس ان کی وحشت نے جن تاریک پردوں کو ڈال کر ان کی حقیقت
 کو چھپا دیا تھا۔ اور تمدن و تہذیب سے ان پردوں پر نظر
 فریب رنگ پڑھا کر جن بعیر توں کو گم کر دیا تھا۔ اسلام نے ان
 سب کو چاک چاک کر دیا۔ اور منور حقیقت جن عجب گولوں میں چھپا
 ہوا تھا۔ ان سے نکل کر عطا تہیہ افکار ہو گیا۔

قرآن حکیم میں انبیاء کے رسولین کے جو قصص مذکور ہیں۔ ان کے
 اندر در حقیقت انہیں بے ساختہ حکم کی روح مضرب ہے۔ جو ان کے
 قلوب میں جلوں کر کے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب سے ہوتی
 تھی۔ ان انبیاء و شہداء کی یادگاروں کے قائم کرنے کے اصل

مقصد کو اسوۂ حسنہ کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو چاہا گیا اس پر توجہ دلاتا ہے۔ چنانچہ تم بار بار انہیں صفحات پر پڑھ چکے ہو کہ اس نے ابو ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ حیات کو مسلمانوں کا قیام و جہ کسبہ النظار قرار دیا۔

قد کان لکم اسوۃ

تمہارے لئے حضرت ابراہیم کی حیات

طیبہ میں اور ان کی زندگی میں یوں

عنتہ فی ابراہیم و

کے ساتھ ہیں۔ پیروی کرنے بہترین

الذین معہ

نمونہ رکھا گیا ہے

(۶۱۴)

واقعات شہادت کی بصیرتیں

اس بنا پر اسلام دنیا

کا پہلا مذہب ہے جو اصلاح

پستی کی صحیح اصول پر تسلیم دیتا ہے۔ اور اسی صحیح اصول کے مطابق

چاہیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعات شہادت کے

انداز نثر و استقالات، صبر و ثبات، استقامت و شکیلی قیام جمہور

بصر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود

ہیں، ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں۔ اور کم از کم سال میں ایک

بار اس غدا ہی قربانی کی روح کو تمام قوم میں جاڑی و سماڑی

کرویں۔

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام

کی ذات میں ایک اور عظیم الشان بصیرت بھی موجود ہے جس کا سلسلہ

ذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے۔

ذہب کی ابتدائی تاریخ اور عالم کی دنیا کی تاریخ کی ابتدا عجیب ہے کسی کی ابتدا میں ہوئی۔ ہم نے دنیا کے سخت سے سخت سرکوں میں پاپ کو پچھے کا شکر کیا۔ بھائی کو بھائی کا حامی بنی کو شکر کا مددگار پاپا ہے لیکن صرف ذہب ہی کا روحانی عالم ایک ایسا عالم ہے جہاں پاپ کو پیچھے بنے۔ بھائی کو بھائی بنے، شکر کو بھائی بنے چھوڑ دیا ہے، بلکہ ان کی مصیبتوں میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔

پاپی ذہب ہے کہ خاندان نبوت ہمیشہ اخرون و انساب کی اعانت سے شروع رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک طرف تک شب و روز اپنی قوم کو دعوت تو میدی، اور قوم سے شکر و انعام سے ان کا دل بچتا ہی کو روک دیا۔ ان سے ان کی اختیار کر لی اور کانوں میں انکیاں تک سے لیں۔

نور سے نور کیا، خدا و خدا پرست	خال سب اثن دعوت
شب و روز دعوت حق کی لکھ کر	توئی لیل و نهاراً
الہا اثر یہاں کہ نور، جھب سے ہوا	نور یزد و عمارت

اذا فراد اوانی کلماد عوتهم زیادہ بھاگنے لگے۔ میں نے جب ان کو
 لتغفر لہم جعلوا صابہم تیری مغفرت کے لئے پکارا انہوں نے
 فی اذا استہم دستغشوا کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ اپنے
 مٹیا بھم و اسرودا کپڑوں میں لپٹ گئے کہ ان کی آواز تیرے
 واستکبروا استکبارا تک پہنچ جائے۔ آہ! یہ حق ناشناس
 قوم ہمیشہ سخت ہٹ ہرنی اور باطل پرست
 گھنڈے کا اظہار کرتی رہی۔

(۱۵۱)

لیکن اس پیغمبر نے آواز کی صدا سے بازگشت صرف ان کی قوم
 ہی کے درو دیوار سے ٹکرا کر ناکامیاب واپس نہیں آئی۔ بلکہ خود ان
 کے گھر کے درو دیوار نے بھی اس کو ٹھوکر لگائی۔ اور خاندان
 نبوت کے چشم و چراغ یعنی ان کے بیٹے نے بھی اس نوز کو قبول نہ
 کیا۔ آخری وقت میں حضرت نوح علیہ السلام نے پھر اپنے بیٹے کو خدا
 کی پناہ میں بلایا۔ لیکن اس وقت بھی اس کا گوشش نصیحت نبویں
 واندہ ہوا۔ اس لئے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذاب الہی کی طوفان
 نصیر موجوں میں بہ گیا۔

ورنادی نوح امینہ وکان اور نوح نے اپنے بیٹے کو جو اپنے ثابت
 فی معنی دیا مبنی اگر کب احوال کی وجہ سے ان سے علیحدہ تھا یکارا
 معنادر کاتکن مع الکفرین کہ اسے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار
 قال ساری الی احبیل ہو جسا۔ اور کافروں کا ساتھ نہ

یصنی من الماء قال لا
اصد الیوم من امر الش
لا من رحمہ وحال بینہما
مروج نکان من المغربین
دے۔ اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ
جاؤں گا۔ اور وہ مجھے اس طوفان سے
بچائے گا۔ نوح نے کہا تو کس ضلالت
عقل میں مبتلا ہے؟ آج خدا کے عذاب
سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔

(۱۱ - ۲۴)

چنانچہ نوح کی پکار کچھ بھی سود مند نہ ہوئی۔ اور اس کے اور
س کے بیٹے درمیان موج حائل ہو گئی۔ اور تمام لوگوں کے
ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگرچہ ان کا ساتھ
دیا۔ لیکن خود ان کی بیوی ان سے علیحدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ
عذاب الہی میں شامل ہو گئی۔

قالوا انا ارسلنا الی قوہ
مجرمین الا ال لوط انا
لنجوہما اجمعین الا امرأۃ
قد دنا اتھا من الغابریں
ترشکان عذاب نے کہا۔ ہم اس
گنکار قوم کو اس کے اعمال بد کا
نتیجہ دکھلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں
ہمارے عذاب سے صرف لوط
خاندان محفوظ رہے گا۔ اور ان

(۱۵ - ۵۸)

میں سے بھی ان کی بی بی قوم کے ساتھ عذاب الہی میں شامل کر لی جائے
گی کیونکہ وہ کافر ہے۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سچا سچ مذہب میں انقلاب کے زمانہ سے خاندانِ نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس دورِ ابراہیمی میں بیٹے نے باپ کی بی بی سے شوہر کی بھائی سے بھائی کی دعوتِ حق پر لیکر کی صدا بلند کی۔ اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر آئیں۔ ان میں بہادر کے شریک رہے۔

۱۱) سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہاں اور وہ کی طرف قدم پڑھایا۔ اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے تختِ جگر کو ایک "وادی غیر ذمی زرع" میں ڈال دیا۔ جہاں کئی سو میل تک آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی جس کے خور و نعلتالی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا۔ تو انھوں نے باپ کے اس سراطعتِ حم کر دیا۔

فلما بلغ معاً المسمى قال
يا بني اني ادرى حق
المسافر اني اذ لبيك فانظر
ماذا ترى ؟ فقال

جب اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم کے پاس
چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ تو انھوں نے ایک دن
اسے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے
کہ گویا تمہیں راہِ حق میں فتح کر رہا ہوں

یا ایت افضل ما تو صر
 سجد فی ان شاء اللہ
 من الصابریں۔ فلسا
 اسلما و تلہ للعبین۔ و
 زادینا ان یا ابراہیم
 قد صدقت الروباہ انا
 كذلك یخدی الخنین
 ان هذا هو البلا
 المبین۔ (۹۹: ۳۷) میں پاپیٹے گا۔

جب پاپیٹے دو ٹوں خدا کے آگے تھکے گئے۔ اور پاپ نے
 زنجیر کے لئے پیٹے کوڑیوں پر بچھاڑا۔ تو اس وقت ہم نے آواز
 سنی۔ اسے ابراہیم! پس کرو۔ تم نے اپنے خواب کو سچ کر
 دیا۔ ہم احسان کو اسی طرح بدلا دیتے ہیں، دراصل
 یہ ایک بہت ہی بڑی سسر پائی تھی۔ جس کی تمہیں کے لئے تم
 سزا ہو گئے تھے۔

۱۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے خاندان کی
 اعانت و رفاقت شریک رہی۔ چنانچہ جب ان کو شمشاد بلور
 کی زبان سے بشارت نبوت دی۔ تو ان کی بی بی ان کے ساتھ
 تھیں۔ بلکہ انہیں کے لئے وہ آتش کردہ طور سے آگ لینی

فلما قضی موسی الاجل
وسار باہلہ انیس سن
جانب الطور ناراً قال
لاہلہ امکشوا فی انست
نار العلی انیکم منہا
بخبر ادر جدوۃ من النار
لکم رطلون :-

(۲۸ - ۲۹)

جب موسے مدین سے اپنی بی بی کو
لیکر چلے۔ تو ان کو کوہ طور کے دامن
آگ کی روشنی نظر آئی۔ انہوں
نے اپنی بیوی سے کہا۔ یہ ہیں
ٹھہرو۔ میں نے ایک آگ
دیکھی ہے۔ اس کا پتہ لگاتا ہوں
شاید تمہارے تاپنے کے لئے آگ
حاصل کر سکوں۔

لیکن وادی ایمن میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا
بلکہ وہ ایک برق خاطف تھی۔ جو فرعون کے خرمن ظلم و استبداد
پر گزنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا
کی صورت میں ان کو یہ صاعقہ ہلاکت دیا۔ اور انہوں نے اپنے
بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا۔ تو خدا نے اس
کو پورا کیا۔

قال سنشد عضدک

بانحیک و نجعل لکما

سلطانا۔

خدا نے کہا کہ میں تیرے دست و بازو
کو تیرے بھائی کی اعانت سے
توی کر دوں گا۔ اور تم دونوں کو فرعون
پر غالب کر دوں گا۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اور وہ دعوت موسوی کے ہمیشہ شریک و امین رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی۔

(۲) پہلے خدا کے ایک صالح بندے نے اپنے پیچھے گو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی کے جام مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے لئے سہولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا۔ اس کی طرف بلا کسی باک کے بڑھے۔

اور ان لوگوں نے نہ تو یہی علیہ السلام کو قتل کیا نہ پھانسی دی۔ بلکہ ان پر اس قربانی کی حقیقت مستحکم ہو گئی۔

وما تقرر وما صلبوا

ولکن شہدوا

(۱۵۶، ۲)

لیکن اسلام
ما قبل ما نہ اسلام میں قربانیوں کی اہمیت کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوتی تھیں۔ وہ شخصی حیثیت رکھتی تھیں۔ یعنی ان پیارے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنے پیچھے یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جیسا کہ یہ ابتداء تھی۔ مگر اس کی تکمیل شریعت اسلام پر موقوف تھی۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح موقوفات و عبادت اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی

اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔ اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر بھی جو قربانیاں کی گئیں۔ وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے تحت جگر کو حند کی نذر کرنا چاہا۔ لیکن اس کا موقع ہی نہ آیا۔ حضرت عیسیٰ سولی کی طرف بڑھے۔ لیکن بچا لئے گئے۔ آج تک تمام خاندان نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی۔ اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلہ انبیاء میں نہیں نظر آتی تھی کہ صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصد رسالت میں ساتھ نہ دیا ہو۔ بلکہ بلا تمیز خاندان نبوت کے اکثر اعضاء و ارکان راہِ حق میں قربان ہوئے ہیں۔

پیغمبر کی شخصی خلافت کی بیعت کے

حادثہ کربلا کی اہمیت لئے جو ہاتھ بڑھے تھے۔ وہ اسلام کی جہودیت کا قلع تھخ کرنا چاہتے تھے۔ اور مذہب کی شہ بانیاں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے جب امیر المؤمنین کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آگیا۔ تو خاندان نبوت کے ذہن و مرد، بال بچے، غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا۔ اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آفوشش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے

اس کا تعلق صرف اسلام ہی کی تاریخ سے نہیں۔ بلکہ اسلام کی اہل
 حقیقت سے ہے۔ یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسماعیل علیہ السلام
 کی ذات سے ظہور ہوا تھا۔ اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام کی ذات تک پہنچ کر کم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسین
 علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندان نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اچھا کارہا ہے
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
 نے گھر بار چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آوارہ گردی کی، اور نبوت
 محمدی کے تابعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدان کر بلا
 کے اندر اس خاتمہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے خاندان نبوت کا سلسلہ نماز ہوا
 ہے۔ انھوں نے ایک دادی پیر ذی زور سے شہادت کی تھی
 ایٹھ یاں بگڑی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السلام نے بھی حسبِ اہل
 کربلا میں اس خاندانی رسوخ کو زندہ کیا۔ اور خاتمہ پانچویں مقصود ہے
 ان مفسرین امامیہ کا جو "ذنیابذخ عظیم" کی تفسیر میں ذبح عظیم
 شہادت امام علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس بارے میں
 بعض ائمہ اہلبیت کرام علیہم السلام کے آثار نقل کرتے ہیں۔

اذ
مولانا ابوالکلام آزاد

علیہ السلام
اسلام

۱۳۳۱

آئیے! سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبت ماتم کو پھر
تازہ کریں۔ کتنے دن گزر گئے کہ راہ و رسم ماتم و شیون سے نا آشنا
ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغاں سخی ہے۔ اور نہ چشم خونبار کی اشک
نشانی۔ کاروبارِ نعم کی رونق افسردہ ہو چلی ہے۔ اور روز بازار و رو
کی چہل پہل رت سے موقوف ہے۔

نہ دلخ تازہ می خار و نہ زخم کہنہ می کار و

بدہ یارب و کے کیں صورت بیجا معنی خواہم

طرا بلس خون آلودہ بیگنان کو اگر لوگوں کے

بھلا دیا۔ مشہر مقدس متبریز کا قصہ

حادثہ درو و الم

غم اگر ذہنوں سے محو ہو گیا۔ مقدوسیا اور البانیہ کے افسانہ ہائے

خوابین اگر فکروں سے فراموش ہو گئے۔ تو کچھ مضائقہ نہیں ارباب
درو و الم کے لئے ایسا ایسی داستان الم صدیوں سے موجود ہے۔ چوٹی

کھلائی نہیں جاسکتی۔ اور اگر لوگ اسے بھی بھلا دیں۔ تو بھی ہر سال
چند ایسے ماتم آلودن تازگی زخم کہن کے لئے آمو جو ہوتے ہیں
جو از سر نو ایک ہزار تین سو برس پیشتر کے ایک حادثہ عظیمہ کی یاد سے
پھر تازہ کر دیتے ہیں۔

پس میرا اشارہ حادثہ ہائے کبرے یعنی شہادت حضرت
سید الشہداء علیہ و اعلیٰ اجدا وہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے
عظیم الشان اجرتا بمبصا فنبنا

وقتت کہ در پیم و خم لوح سمرانی
سوز و نفس لوحہ گر از بلخ نوالی
وقتت کہ آن پروگیاں کز وہ تعظیم
بر درگشاں کردہ فلک ناصبہ سانی
از شمیم آتش زودہ عریان پدرا سپید
چوں شملہ دغاں بر سر شاں کردہ روانی
جانہما تہ فرسودہ کشتنیش اسیرتہ
دلہا ہمہ جوں کشتن اندوہ رخصالی
تہاست تہین ابن علی در صفیہ اندرا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجالی

پتا پتہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندہ کیا ہے سوئے شہداء
کی ضرورت ہے۔ جن ارباب سجادہ کو روح کی راحت کے لئے جسم کے

ماتم کی تلاش ہو جن کی زبانیں آہ و فغاں کو خوب اور جن کی آنکھیں
خونباز فشانی کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہوں۔ ان کی صحبت ماتم
والہم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامانِ علم اپنے اندر رکھتا
ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہ
جائیں اور ہتھیار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات
بکسر جنبش میں آجائیں۔ جب بھی ان کی ندر حال اس الہامِ سرانی
سے قاصر رہے گی جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ
قرائے عبرت و بصیرت ہے۔

لیکن آہ! کتنے دل ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بھائی
و معارف کے اندر دیکھا ہے۔ اور کتنی آنکھیں ہیں جو حسین ابن علی
شہید پر گریہ و بکا کرتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ کو کھلی سامنے
رکھتے ہیں۔ جو اس حادثہ عظیم کے اندر موجود ہے۔

فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی۔ جو صرف اس
لئے ہوئی تاکہ پیر و انِ اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے
اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اس کے ثبات و استقامت کی
ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال قائم کر دے پس جو بے خبر ہیں ان
کو دونا چاہیے ان الحمد للہ کو افتیا کو اور جو دوستے ہیں ان کو
صرف رونے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے سید الشہدا

نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے۔ اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو۔ جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

ضرورت ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس حادثہ ہائے
اسوۂ حسینی شہادت پر نظر ڈالی جائے۔ سب سے پہلے اس کی
 تاریخی حیثیت نمایاں کر کے ان تمام مواعظ و مشایخ عظیمہ کو ایک ایک
 کر کے بیان کیا جائے جو اس ذبح عظیم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اور جن کی
 لسان حیات آج بھی اسی طرح صدا دے رہی ہے جس طرح کنارافرات
 کی ریتلی سرزمین پر ایسے بارہ سو برس پہلے زخم و خون کے اندر سے
 وعظ فرمائے حقیقت و صداقت تھی۔

دنیا میں ہر جرم جانی ہے کہ فانی ہے۔ مگر خون شہادت کے ان
 قطروں کے لئے جو اپنے اندر حیات الہیہ کی روح رکھتے ہیں
 کبھی بھی فنا نہیں۔

کشکانِ نخبِ سلیم را

ہر زماں از غیب جانے و پیکر است

یہاں صرف چند ٹھہل اشارات پر اکتفا کروں گا

گو خود حدیث مفصل بنواں از میں ٹھہل

۱) سب سے پہلا ثبوت جو یہ حادثہ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا
 ہے، دعوت الی الحق، اور حق و حرمت کی راہ میں اپنے تئیں قربان

کرنا ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو، کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی انھوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا۔ اور مشورہ و اجماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ اور کمر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الہیہ نہ تھا۔ بلکہ محض اغراض نفسانہ و مقاصد سیاسیہ، ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی۔ اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔ حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی۔ اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی۔ اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا مقابلہ متبادلہ کروادو کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو۔ جو خدا کی بیعت ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو، اور جس کے احکام مستبدہ و جاہلہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

(۲) مقابلہ کے لیے یہ ضرور نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے کیونکہ حسین ابن علیؑ کے ساتھ چند ضعیفہ و مساکین کی جمیعت قلیل تھی اور

در کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ تاج کے فکر سے بے پروا ہے۔
 تاج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اس قوت قاہرہ عاقلہ الہیہ
 کا کام ہے۔ جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصاف کے کامیاب و
 فتح کرتی۔ اور ظلم کو باوجود جمہوریت عظمت دنیوی کے نامراد و ننگینا
 کرتی ہے۔ دکن من فتاة قليلة غلبت فتاة كثيرة

بازن الشارح

یسے موقعوں پر ہمیشہ مصالحت اندیشیوں کا خیال دامن گیر
 ہوتا ہے۔ جو فی نفسہ اگرچہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے۔ لیکن
 کبھی شیطان رجیم بھی اس کے ہمیں میں آکر کام کرنے لگتا ہے۔
 نفس و جماع حیلہ بازیائیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے اکتیس کرنا اور
 اور چند انسانوں کا خون بہا لینے سے کیا حاصل؟ توپ و تفنگ
 اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں۔

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاج عالم کی صدا
 انشال مقدمہ و شرمہ جہاد سے قطع نظر تمہارے سامنے خود منظم
 کرنا کی مثال موجود ہے۔ تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے عکرموں کی
 قوتوں اور ساز و سامان کا مقدمہ کہہ کیا ہے۔ کہ کبھی بھی کیا جاسکتا
 ہے کہتا ہوں۔ حسین بن علی نے صرف بہتر اسٹیج جو کہہ پراسا
 انسان کے ساتھ اس عظیم الشان حکومت، قاہرہ ہا برکامت کیا
 جہاں کے سرور سلطنت لہان سرور انیس تک پہنچنے والے تھے۔

اور گویہ سچ ہے کہ اس نے آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے
 ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا۔ اور پھر ایک
 ایک کر کے ان میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا۔ اور جاں
 بحق تسلیم ہوا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے پینے کے لئے نہ
 تو پانی چھین سکا۔ اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کر سکا
 اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے
 چوہ ہوا۔ اور اس خلعت شہادت لالہ گوں سے آراستہ ہو کر تیار ہوا
 تاکہ اس کو شہ ساز عجایب کے حرم وصال میں پہنچے۔ جو دو ستروں
 کو خاک و خون میں تڑپانا اور دشمنوں کو ہلاکت دینا ہے۔

ارید وصال و یرید قسطلی

تاہم منہج اس کو تھی اور فیروز مندی و کافرانی کا تاج صرف اسی
 کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں روتا
 پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اس
 کے زخموں سے رینگ و سنگ پر بہتا تھا۔ انقلاب و تحریک کے وہ
 سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے۔ جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی
 روک سکی۔ نہ حجاج کی بے اماں خو خوارمی اور عبد الملک کی تدبیر و
 سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان
 کے شعابوں کی پرورش کرتا رہا۔ اور حکومت و تسلط کا غور ہو این کہ
 ان کی ایک چنگاری کو آتشکدہ سوزاں بنا تا رہا۔ یہاں تک کہ آخری

وقت آگیا اور جو کچھ ۶۲ حصہ میں کر بلا کے اندر ہوا مفادہ سب کچھ ۶۲ حصہ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے۔ ان کی لاشیں گھوڑوں کے بھروسے پامال کی گئیں۔ فتح مندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا۔ اور اس طرح فیصلہ الذین ظلموا

ای منقلب ینقلبون :- کا پورا پورا ظہور ہوا۔

کیا یہ سب کچھ جو ہوا وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابوم خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ تھا۔ کیا یہ اسی خون کا نچوڑ نہ تھا۔ جو خرات کے کنارے بہایا گیا تھا۔ پھر یہ فتح مندی تو ظاہر ہے جس کے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کیا پڑا۔ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے۔ اسی وقت اپنی ضرورت فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔

۱۳۱۔ بہر حال یہ توحق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں۔ جو کبھی ظاہر ہو سکے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن حضرت سید الشہداء کا افسوس مند بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا بھی پروا نہ کرو۔ اگر ظلم اور جارحانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی مانگنا ضروری ہے۔ اور اسے ہوتا ہی چاہیے۔ تعداد کی قلت و کثرت یا سنا ان دو مسائل کا فقدان اس پر مؤثر نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم کا صاحبہا شکر و عذر ہونا اس کے لئے کوئی الہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت ہی کر لی جائے۔

ظالم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے کیوں
وہ ظلم ہے اور حق و صداقت ہر حال میں یکساں اور غیب مرتزلزل
ہے۔

۴۴ حق و صداقت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب
رہا ہیں۔ قدم قدم پر حفظ جان و ناموس اور نجات نسوز و نوبال
کے کھنڈے دامن لپیٹتے ہیں۔ لیکن یہ اسوۂ حسنہ نمونین و مخلصین
کو درس دیتا ہے۔ کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و
ہمت کو اچھی طرح آزمائیں۔ نہ کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے
جرم را اپنی جا عقوبت ہست و استغفار نسبت

اس قلیل جاودہ حق و صداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا۔ اس کا
اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی آزمائشوں
کے متعدد درجے بیان کئے ہیں۔

و لیلونکم بشی است	اللہ تعالیٰ ہمیں آزمائشوں میں ڈالے گا
الغوت والجوع والنقص	وہ حالت خوف و ہراس، بھوک اور
مناکاموال واکانفس	پیس، نقصان جان و مال اور ہلاکت
والشہات۔ ولبش	اولاد و اقاہب میں مبتلا کیے تھیں
الصابرین الذین اذا	صبر و استقامت کو آزمائشیں گاہیں اللہ
امنا بشی مصیبنا	کی طرف سے پشانتا ہے ان کے لئے
قالوا اننا للشیعرا منا	جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے

النبي راجعون (۲۸۱۵۲) کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تو اپنے تمام معاملات کو یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون! خوف و ہراس، بھوک اور پیاس نقصان اموال و مستناع قتل نفس اور اولاد یہی چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مہینیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اپنی چیزوں کو راہ الہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔

لیکن مظلوم کر بلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کر کے موجود تھے۔ وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحے کے اندر نجات پا کر آرام و راحت اور شوکت و عظمت حاصل کر سکتا تھا۔ اگر حکومت ظالمانہ کی وفاداری و اطاعت کا عہد کر لیتا۔ اور حق و صداقت سے روگردانی کے لئے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتا۔ پر اس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی، اور حق کا عشق زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آ گیا۔ اس نے اپنا سر دیدیا کہ انسان کے پاس حق کے لئے یہی ایک آخری متاع ہے۔ پر اطاعت و فرار و فاداری کا ہاتھ نہ۔ اچھوت حق و عدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا۔ ومن الناس من يتسوى

نفسه ابتغاء مرضات الله، والله روف بالعباد!

(۵) سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثہ عظیمہ کی لسان حال اس کی ترجمانی کرتی ہے۔ راہ مصائب و جہاد حق میں صبر و استقامت اور عزم ثبات ہے کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا

دوسری جگہ کہا۔ فاستقم كما امرت اوللہ درما قال

روید کشادہ باید پیشانی فرخ

آنجا کہ لطمہ ہائے پدر اللہ فی زند

فی الحقیقت اس شہادتِ عظیمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے

کہ اپنے تمام عزیز واقارب اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشت

وغربت و مصائب میں محصور اعدا ہونا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہجر

گوشوں کو شدتِ عطش و چرغ سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا۔ پھر ان

میں سے ایک ایک کی خون آلود لاشیں کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا۔ حتیٰ

کہ اپنے طفل شیرخوار کو بھی پیرِ ظلم و بربریت سے نچر پاتا۔ مگر باہیں ہمہ

راہ شوق و صداقت ہیں جو پیمانِ صبر و استقامت باندھا تھا۔ اس کا ایک

لحظہ بلکہ ایک عشر و قیام کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا۔ اور حق کی راہ میں جس

قدرِ مصائب و اندوہ پیش آئے سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت

کرنا کہ رضینا بقضائنا و صبرنا علی بلائنا

پیکانِ تریجاں خریدار من مرہم و میگراں نحواہم

دست کے ہاتھ سے ہمام زہر بھی ملتا ہے۔ گوشنہ گامان زلال

شیت سے پیروں کے ہمام شہد و شکر پرتو تریج وسیتے ہیں

اسے جفا ہائے تو خوشتر زونائے و گراں

آج بھی اگر کوئی حقیقت نبوش باز ہو۔ تو خاک کربلا کا ایک ایک

ذره تو صیہ فرمائے صبر و استقامت ہے۔

شیرم خاک و لسیکن بیوسے ترمب ما
تواں شاخت کوں خاک مردی خیزد

اگر اس صبر و استقامت کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو خدا را
بایح کی طرف توجہ کرو۔ صرف ایک روایت یہاں لکھوں گا۔ تاکہ جو
لوگ خاندان نبوت اور فخر و حضرت رسالت کی محبت کا دعوے
کرتے ہیں وہ شور کریں کہ ادوارِ محبت بغیر مثالہ بیکار ہے۔

حضرت امام علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام کہتے ہیں۔

جس رات کو میدان شہادت گرم ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ میں اسی شب
کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری بیوی زینب میری بیمار داری
میں مصروف تھیں۔ انہوں نے حضرت امام حسین و اہل ہوسنے۔ وہ

چند اشعار پڑھ لئے تھے۔ جن میں سن کر میں کہہ گیا کہ ان کا ارادہ
کیا ہے؟ میری آنکھوں سے یہ اختیار اُسوۂ جاری ہو گئے اور مجھے

ہو گیا کہ تم پر ابتلاء الہی نازل ہو گئی ہے۔ اور اب اس سے چارہ نہیں۔

مگر حضرت زینب نے غصہ نہ کر سکیں۔ کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں یا وہ

رفیق القلب ہوتی ہیں۔ وہ ماتم کماں چلا کٹیں۔ واعرنا و امیتنا: الیوم

انت قاطر و علی اولیٰ ابن علی۔

لیکن جب حضرت حسین نے یہ حالت دیکھی۔ تو ان کی چاشنی شوق

ہوئے اور کہا کہ اے بہن! یہ کیا ہے صبری اور کیا جزع و فزع ہے۔ اللہ

سے ڈرو کہ موت یقیناً ایک آبیروالی چھینر ہے۔ اور اس سے کوئی

بچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینب شہداء و خواتین سے منظر تھیں۔ وہ دیکھ کر
 رہی تھی کہ آنے والی صبح کن واقعات خونین کے ساتھ طلوع ہوگی۔
 غم میں انہوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا۔ گریبان بھاڑ ڈالا۔ اور واہلا وا
 حضرتنا پکارتی ہوئی پہنچش اپنے بھائی پر گم ٹپڑیں۔ حضرت حسین نے یہ
 حالت دیکھ کر ان کے منہ پر پانی ڈالا اور جب ہوش میں آئیں تو فرمایا۔
 اے بہن یہ کیسا غم و حزن ہے جو تم کو رہی ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے
 حکم و فرمان کے مطابق جو طریق عز و حزن ہے اسے اختیار کرو۔ کیونکہ میرے
 لئے اور ہر ایک مسلم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے
 اعمال و افعال میں اتباع و پیروی کے لئے بہترین نمونہ ہے!
 اللہ اکبر! خانہ ان نبوت کے اس مرتبہ رفیع اور اس درجہ عظیم کو
 دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کس طرح ان کے
 سامنے تھا۔ اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۂ حسنہ کے حکم کے آگے
 کس طرح انہوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا۔
 ایسے سخت گیر اور زہرہ گداز موقعہ پر بھی اپنی بہن کا جزع و فرع ایسی
 گوارا نہ ہوا۔ اور بچائے عام الفاظ صبر و شکی کہنے کے فرمایا تو یہ فرمایا کہ خان
 فی و لکل مسلم اسوۂ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 پھر آج کتنے مدعیان محبت اہل بیت کرام ہیں۔ جو اس اسوۂ حسنہ
 کے اتباع کا اپنے اعمال سے ثبوت دے سکتے ہیں؟

انس -

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
 شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر وھلی

ذاکر حسین
 علیہ السلام

ہندوستان کی سرزمین پر جہاں ہر مذہب و ملت
 کے اہل دل ہمیشہ سے کثرت میں وحدت دیکھتے اور
 دکھاتے رہے ہیں۔ یہ بات کہنے کے لئے کسی دلیل اور بحث کی ضرورت
 نہیں ہے کہ حق کا نور ایک ہے۔ مگر دیکھنے والے ان میں ہمیشہ اور جتنی
 دیدار کی طاقت ہے اس کا جلوہ اپنے اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں
 اور اس کی کیفیت اپنی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی بات
 اس طرح کہنی ہو کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اور اس
 سے اپنے اپنے دل پر ٹھیک ٹھیک اثر لے سکیں۔ تو نکتوں اور مذہبوں
 کا جدا جدا بولیوں اور الگ الگ مخصوص اصطلاحوں کو چھوڑ کر اسے انسانیت
 کی عام زبان میں کہنا ہوتا ہے۔ شہادت حسین کے موضوع پر کچھ لکھنے اور
 لکھوانے کا مقصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ فخر انسانیت کے
 اور مایہ ناز بشریت حسین کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے
 عام معیاروں پر رکھا جائے۔ اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں

بیان کیا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ ایک عاویہ کو دوسرے عاویہ میں ترجمہ کرنا کھٹن ہے۔ اور جب اس کے ساتھ یہ شرط ہو کہ ترجمے کی زبان وہ ہو جو انسانوں کے دل کی زبان ہے۔ تو یہ کام اور کھٹی کھٹن ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جو حضرت امام حسینؑ کا حال مذہبی رنگ میں سننے اور سنانے کا عادی ہے۔ اسے اس نئے رنگ میں اس طرح بیان کرنا کہ اس ذکر سے جو کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ وہی دوسروں کے دل میں پیدا ہو جائے۔ بہت مشکل ہے۔ مگر یہ بات بہت سبب رکھتی ہے کہ جب سننے والوں کے دل ہمہ رومی اور عبت سے سمجھنے پر آمادہ ہوں۔ تو وہ اور کئی بات بلکہ بہت کئی بات سمجھ لیتے ہیں۔

آپ یہاں سوال

واقعہ شہادت اور عالم السانیت پر پیدا ہوتا ہے کہ اس عام السانیت کے لئے حین اکی شہادت کیا ثننت طیبی کی بس ایک ناکام کوشش ہے۔ جس میں آپ کو ناکام و سر بقی سے ایک تاریخی بہر رومی کسی ہے؟ یا یہ محض ایک محرور المزاج سردار کی مستعدا ناقبت اندیشی ہے۔ جس میں شد کرنے والا اتفاق سے آپ کے مچوٹا اور مخدوم آت کا جگر گوشہ ہے۔ اس لئے آپ اس کی پک کرتے ہیں۔ کیا یہ پید رومی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹانے کی دل ہلانے والی کہا جاتا ہے۔ جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

اور آئندوں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جا رہی ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرف داروں کے لئے اس قدر اور مواقع ہیں۔ اور وہ شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور ناہمدردیوں اور ہمدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اتنی پرہے کہ صرف ان کے لئے تو دنیا کو حسین کی داستان کی خاص ضرورت نہیں۔ لیکن حسین کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے، شرف انسانی کی کہانی ہے۔ انسان کی پستی سے بلندی کی طرف ارتقا کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ یہ بھی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے۔ اور انسانوں میں اس کے پیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ چہرا ہے۔ اس چراغ کو باطل کی توتیں جب کبھی اپنی بھونٹکھوں سے بچھاتا چاہتی ہیں۔ تو حسین کی یاد اس کی لہر کو روشن کر دیتی ہے۔ جب راہ حق و حریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ تو حسین کی مثال سے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت و قوت و اقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمیعتوں پر عرصہ زندگی تنگ کرتی ہے۔ اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے

ویر سے دل میں ڈالتا ہے۔ تو حسین کی مثال ہی انہیں ثبات
 نئی کا سبق دیتی ہے۔ اور پاس کی کفر آفرینی سے بچانی ہے، جب
 اعمیٰ زندگی کا فساد فرو کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے۔ تو حسین کی
 نال اس فرو کو اس کی ذمہ داری یاد دلاتی ہے۔ کہ جماعت کو اخلاقی
 اعت سبٹانے کا فریضہ آخیری طور پر اسی پر عاید ہوتا ہے۔ چاہے
 اس کو شمش میں جماعت سے زہر کا پیالہ پلائے۔ یا
 دی پر چڑھائے۔ سنگسار کرے یا سرتن سے جدا کر کے تہادت
 کے خون سے زمین کو لالہ زار بنا دے۔ زندگی کے حیرتیں انسانوں
 حسین یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جتنے نام نہیں
 ہے اور چلتا ہے۔ کہ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جب کا میانی کے طلائی پتھر سے کی پرستش ہر سو ہو رہی ہو تو حسین
 ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے۔ اور حسین کی ناکامی کے
 روبرو باطل کی ساری تختیاں سرنگوں و شرمسار نظر آتی ہیں

لیکن آخر یہ سب کیا کیوں؟
 حسین کی عظمت اور اس کا کارنامہ اس لیے کہ حسین نے اپنی

جان و بیکر خدا کی خدائی اور انسان کی شرافت پرستش ہا دستا دی ہے
 اور اس دستاویز پر اپنی خون سے ہر مثبت کی ہے۔ یہ انسان
 شرافت کیا ہے؟ یہاں ہم پر انسان کو کون سی چیز ہر ترقی کا مرتبہ دیتی ہے

اس کے سینے میں ہیں قانون و اخلاق کا وجدان یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوبتر کہاں؟ اس کے دل میں اعلیٰ اقدار کا ذوق و شوق ادا سے اعلیٰ کی طرف لے جانے کا قصد اعلیٰ کو جان کر ادا پر قناعت سے اس کی فطری بیزار می، پھر ان اقدار اعلیٰ کا مطلق اور کامل جنیت میں یقین اور اس پر اس کے قلب و ضمیر کی تصدیق یہی صفات اخلاقی کے وہ مکمل نمونے ہیں۔ جن پر ہر چیز کی قدر و قیمت پر کھی جاتی ہے۔ مثلاً عدل، حق، خیر، حسن، انہیں سے اس کی شب تار حیات میں روشنی کی جھلک ہے۔ انہی سے اس کی بے چینی میں سکون اور پراگندگی میں دل چھٹی کا سامان ہے۔ وہ بھگتا ہے تو یہی دلیل راہ ہوتی ہے۔ زندگی کے دورا ہے پر جب یہ کفر کی طرف جاتا ہے۔ تو یہی اسے شکر کی طرف گھنٹی ہیں۔

اسفل الساعیہ میں بھی احسن تقویہ یا اولائی ہے۔ انہیں مھلایا جاتا ہے۔ مگر یہ پھر بار بار آتی ہے۔ انہیں وہ پایا جاتا ہے مگر پھر ابھرتی ہیں۔ ان سے بدکنے والے وحشی بھی ڈرتے پھر ان کے ان کو جانتے ہیں تکتے۔ یہ اقدار مطلقہ جو اس میں ظاہری سے محسوس نہیں ہو سکتیں۔ ان کا تصور کیا جاسکتا ہے چشم ظاہر ان کے نظارے شروع ہے۔ صرف چشم باطن ہی کو ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر ملک میں خدا کے ایسے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ جو ان اقدار کو بے حجاب اس طرح دیکھتے ہیں۔ جیسے

چاند، سورج، ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کے نور سے وہ دنیا کی ہر چیز کو، زندگی کے ہر شعبے کو، انفرادی ہو کہ اجتماعی مسود کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قول سے ان اعلیٰ قدروں کی تخلیق کرتے ہیں اپنے عمل سے۔ ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھیں اپنے پرطاری کرتے ہیں، اپنے اندر چلتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کی روشنی سے دوسروں کی نظریں ان تک پہنچاتے ہیں۔ اور دوسروں کے دل ان کی طرف جھکاتے ہیں۔ اور جب انسان کی بہیمیت ان پر زلف کرتی ہے۔ تو ان کی حفاظت کرنے لگتا ہو جاتے ہیں حفاظت میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا اصلی رنگ ناکامی میں نکھر رہا ہے۔ ان کی ظاہری کامیابی سے ان کی پیش کردہ اقتدار پر یقین استنار واضح نہیں ہوتا۔ جتنا اس وقت ہوتا ہے، جب باطل کی پینٹ اتنی شدید ہوتی ہے۔ کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شکست یقینی ہوتی ہے۔ اور یہ ناکامی اور شکست کے یقینی ہونے کے باوجود اعلیٰ کو چھوڑ کر اگلے کے ساتھی نہیں بنتے۔ اس پر گالیار کھاتے ہیں۔ بلیس سمجھتے ہیں۔ تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ اور اگر یہ "مرتبہ بلور" نصیب میں ہوتا ہے۔ تو آخر کار جان کی نذر پیش کر کے اپنی چھتائی کا آخری ثبوت دے دیتے ہیں۔ اور انسانیت کو جا دیتے ہیں کہ کامیابی اور اقتدار کی لاگ سے وہ کہیں پہنچے نہ سگھڑے کہ ان اقتدار پر ملتے کی

سیوا بس اسی وقت تک ہے۔ جب تک فتح منڈیاں ہیں۔ نہیں ان کے ساتھ رہ کر نا کامیاں دوسروں کے ساتھ کی کامیابیوں سے اعلیٰ کی خاطر بدنامیاں، ادا کرنے کے ساتھ کی نیک نامیوں سے بہتر ہیں۔ ان کی جلو کی رسوائیاں بڑی بڑی کامرائیوں سے زیادہ وسیع اور ان کی سنگت کی تنہائیاں۔ لشکروں اور حبشیوں پر قابیل تزیج میں حسین انھیں اقدار مطلقہ کے علمبردار تھے۔ انھیں کے لئے پختہ، انھیں کے لئے لڑے۔ اور انھیں پر اپنی جان نثار کر دی۔ اور اپنی زندگی اور اپنی موت دونوں سے انسانیت کے لئے ایک دائمی شمع ہدایت روشن فرما گئے۔ اس شمع کی روشنی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نما ہے۔ لیکن جامع زندگی کی گراہیوں میں اس شمع سے کتاب نور کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

انہما حق و باطل انسان کا فرض ہے نزدیک دین اسلام کے کی بنا، اقدار کی وحدت پر ہے، بنیادی اقدار حکم اور حکمت اور حق ہیں حکمت اور حق بنیادی اقدار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ میں صرف حکم کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے مراد ہے حکومت۔ اقتدار اعلیٰ ذرا سوچتے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی کی اچھی سیاسی تشکیل بدل اور انتہات پر مبنی حکومت کا قیام انسان کی اخلاقی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے اچھی حکومت بھی ایک اخلاقی

تندرہ کہتی ہے۔ اور اس کا ایک مکمل نمونہ ہماری ہدایت کے لئے
ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا حکمت اور حق کا۔ اس کا نام
حکم ہے۔ حکم، حکمت اور حق کو ایک ماننا اسلام کی تعلیم ہے۔ یعنی
اسلام یہ کہتا ہے کہ حکم بھی اسی ذات کے لئے ہے۔ جو عین حق اور
عین حکمت ہے۔ عبادت یعنی غیر مشروط اور غیر محدود و اطاعت
صرف اسی کی کرنی چاہیے۔ اور کسی کی نہیں۔ شرطوں کے ساتھ
اور حدود کے اندر دوسرے کی اطاعت بھی کی جاسکتی ہے۔ مگر
مشروط اور حد یہی ہے کہ مجازی حکم، حقیقی حکم، اور حکمت اور حق کے
خلاف نہ ہو۔ اگر دنیا میں حکم حقیقی قائم ہو۔ تو انسان کا کھلا ہوا فرض
ہے کہ بغیر کسی شرط کے اس کی اطاعت کرے۔ لیکن اگر حکم مجازی
کا دور دورہ ہے۔ تو اطاعت کے لئے مشرطیں لگانی پڑتی ہیں۔
جن میں سب سے پہلی چیز یہی ہے۔ کہ انسان کو کوئی کام اس سے
حکم کے خلاف نہ کرنا پڑے، جسے وہ حکم حقیقی جانتا ہے۔ لیکن
سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے۔ جب حکم مجازی
سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہو۔ اور انسان کو اس کے خلاف ورنہ
پر مجبور کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مشکل جس کے تصور تک سے حق پسند
کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ یہ ہے کہ باطل کی حکومرت سے یہ مطالبہ کیسے
کرائے حکم حقیقی سمجھا جائے۔ جب دنیا پر یہ مرصیدیت آئے۔ تو آدمی
کا فرض ہے کہ وہ قول سے فیصلہ سے یہ اعلان کرے۔ کہ یہ باطل

کی حکومت سر اسر حکم حقیقی کے خلاف ہے۔ میں اس کے آگے سر نہ
 سر نہ جھکاؤں گا۔ اور کوئی اس کے آگے سر نہ جھکائے، اس
 اعلان کا نام شہادت ہے، اس شہادت پر باطل کی قوتیں
 ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مگر اس کے سارے ظلم سہہ کر ہی مرد حق و
 کو حق و باطل کا فرق دکھا سکتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ
 قد اعلیٰ کو بے حجاب دیکھنے والے کم ہوتے ہیں، اب یہ مرد
 حق جو حکم حقیقی کو بے حجاب دیکھ رہا ہے۔ دنیا کے کم نگاہوں
 کو کس طرح دکھائے، سوا اس کے کہ اس راہ میں تشرانیاں
 کر کے اپنے عقیدے کی قوت سے دلوں کو پھیلانے۔ کبھی
 کبھی اس راہ میں جان دے کر آخری تشرانیاں دینی پڑتی
 ہیں جو شخص جان دے کر باطل کے مقابلے میں آخر دم
 تک حق کا اعلان کرے، وہی شہادت کے سب سے اونچے
 درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اور عام طور پر ہمیشہ صرف اسی کو کہتے ہیں۔
باطل سے جنگ دیکھئے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ جسے
 مسلمان سب سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں، گزر چکا ہے۔ حکم حقیقی یعنی
 خلافت راشدہ کا دور ختم ہوتا ہے۔ حکم مجازی یعنی ملوکیت کا دور
 آتا ہے۔ حکم حقیقی کے خلاف ملک کے حکماہل، ذاتی ملک بنتے
 ہیں، اور بادشاہ بہت بڑا حشرانہ جمع کر کے دولت کے بل پر

بہی قوت بڑھاتا ہے۔ اور عالم اسلامی کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے، کچھ لوگ ڈر سے، کچھ لالچ سے سر جھکا دیتے ہیں بعض ایسے ہیں جو نہیں جھکتے۔ انہی میں سے رسول کے نواسے حسین کا سر ہے، لالچ و ہمکنی فریب سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر حسینؑ پر زیادہ کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ جہاں حسینؑ جن کی رگوں میں علیؑ، فاطمہؑ اور محمدؑ کا خون تھا۔ جن کے دل میں حق کا خوف اور حق کا عشق تھا۔ حکم باطل کو حکم حق کیسے کہہ دیتے۔ حسین نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اعلان کر دیا کہ پروردگار کا حکم حکم باطل ہے، یہ پہلی شہادت تھی۔

ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ گئے ہیں گنہگار حسینؑ نصیب نہ ہوا، ترک وطن کر کے عراق کا قصد کیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مجھے پروردگار کے حکم کے باطل ہونے پر اس درجہ یقین ہے اور اسے قبول کرنے سے اس شدت سے انکار ہے کہ ترک وطن کی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں، یہ دوسری شہادت تھی۔

کوفے کی راہ میں کربلا کے مقام پر پروردگار کے لشکر نے حسینؑ کی راہ روکی۔ اور ان کا چہرٹا سا لشکر گھم گیا، اب آخری و تشریفاتی اور آخری امتحان کا سامنا تھا۔ حسینؑ نے آخری قربانی پیش کی، آخری امتحان میں پورے اترے، ان کے ساتھیوں اور عزیزوں میں سے ایک

ایک مارا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے قتل ہو گئے۔ آخر خود حسین
 زخموں سے چور چور زمین پر گر پڑے۔ مگر ان کے دل میں یہی تھا۔ ان کی
 زبان پر یہی تھا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔
 یہ تیسری اور آخری شہادت تھی۔

کہتے ہیں کہ جب لشکرِ شام والے حنین کے اہل بیت کو اسیر
 کر کے اور کربلا کے شہیدوں کے سر تیزے پر چڑھا کر لے چلے۔ تو راہ
 میں ہر جگہ حسین کا سر اللہ کی وحدت اور بڑائی اور اس کے حکم
 کی شہادت دیتا تھا۔ مذہبی عقیدت اس بات کو لفظاً بھی
 صحیح مان سکتی ہے۔ مگر اس سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو واقعی
 حسین کا سر جہاں کہیں بھی گیا ہوگا۔ زبان حال سے حکم حق کی شہادت
 دیتا ہوگا۔ آج تیرہ سو سال بعد بھی حسین کی مثال بلکہ حسین کا نام
 اس کی شہادت دیتا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا۔ کہ حکم صرف
 اللہ ہی کے لئے ہے۔

جب کبھی دنیا میں حکم حقیقی کی تندر کا تسلط ہوگا۔ تو دنیا ضرور
 یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے کس
 طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر کر دی تھی۔ جب دنیا میں
 افراد اور اقوام ان اقتدارِ اعلیٰ کے سیوک کی حیثیت سے ارتقاء
 روحانی و ذہنی کے منازل سبب رفتاری سے طے کرتی ہوں گی۔ اور
 ان تندرؤں کے حاملوں سے ناکافی سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔ تو

وہ ضرور یاد کرے گی کہ صدیوں پہلے اے بے پار و مددگار حق پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان کے اعتماد کی ہمت کی ہمت کی تھی۔ اور جب دنیا کی طاقت و جبر سے اس کے خلافت تھی تو انہیں کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ جب دنیا صرف ایک خدا کے ڈرے گی۔ اور اس طرح اور مسیحیوں کے ڈرے نجات پا چکی ہوگی۔ تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہ کے لال سے میرا ن کر بلا میں اپنا سر کھڑا کرے کہ اس اطاعت اور سرطنتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت یہ بے زحمتوں کا حکمراں دکھائی دے گا۔ یہ نام دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا۔ اور اس کا خاک و خون میں لٹھرا ہوا سر الہی سطوت و جبروت کا علم معلوم ہوگا۔ اور نہ اروت ابیری کے لفظوں میں سر پہ زرخش ہو جائے گا۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین

دین است حسین دین پناہ است حسین

سر دادند دست در دست پرید

حقا کہ پناہ سے لالہ است حسین

۱۵۱
 مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

سہ ماہی

ننپے کی تربیت و پرورش کے لئے محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت وہ ہے جسے باپ کہتے ہیں۔ لیکن کیا تمنا ہے کہ وہ بڑو توڑ دیا گیا۔ اور پیدا ہونے سے پیشتر ہی توڑ دیا گیا وہ آیا۔ اور اس مشان کے ساتھ آیا کہ جس کو لوگ پالنے والا کہتے ہیں۔ وہ مدینہ کے ایک میدان میں سویا ہوا تھا۔ سعد کے کہنے والو دوڑو اور اس بچہ کو چھپاتی سے لگاؤ۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

جن کے پاس سب کچھ تھا۔ انھیں ڈھکیل دیا گیا۔ جس کی اوتھی کا تھن خشک ہو چکا تھا۔ اور خود جس کے پاس دو دھکا ایک قطرہ نہ تھا، کچھ نہ تھا، اسی نے گود میں اٹھا لیا۔ جب واپس کرنے آئی تو تمنا سے کا یہ کیسا دردناک حصہ تھا کہ ایوار کے ایک جھونپڑے میں اس بچے کی تربیت و پرداخت کرنے والی دوسری قوت بھی ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی۔

پیر مرد، بوڑھا دادا اٹھتا ہے، اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے
 لیکن قدرت جس کے ساتھ کچھ نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ اٹھتی ہے اور
 اس ہاتھ کو بھی جھٹک کر علیحدہ کر دیتی ہے۔ اس کوئی نہیں، اس
 بچے کا کوئی نہیں، اس کے پاس کچھ نہیں! ہاں بہت سے چچا ہیں۔
 لیکن جن کے پاس بہت کچھ تھا۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ
 دیکھا۔ ان میں جو سب سے زیادہ نادار تھا۔ اس کے بچوں
 ہی میں وہ بھی ہل ہل گیا۔ چچا نے نہیں بلکہ پیتھنے نے بکریاں
 چرا کر اس کو کچھ دیا۔ اور اسی میں سے کچھ خود بھی
 کھالیا۔

الغرض ایک بچہ پیدا ہوتا ہے و علی اللہ علیہ وسلم جس کے
 ساتھ نہ باپ کی قوت ہے نہ ماں کی قوت، نہ اقربا اور انہ کی قوت
 ہے۔ کوئی قوت نہیں ہے۔ مگر وہ جس ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ
 بھی ہر قسم کی نباتاتی اور حیوانی قوتوں سے خالی ہے۔ میدان ہے۔ اور
 پیشیل میدان ہے، اس کا نام بن کھیتی کا بیابان ہے، نہ اس کے
 گھنٹوں میں ندیاں بہتی ہیں۔ اور نہ دریاؤں کا شیریں پانی اس کو سیراب
 کرتا ہے، نہ سرسبز مزار ہیں۔ نہ نظر فریب گلزار ہیں۔ الغرض انسانی
 دل و دماغ کے سنوارنے اور ابھارنے میں جن قدرتی ذرائع کو دماغ سے
 ان میں سے بھی اس میدان میں کچھ نہیں ہے۔ وہ جس شہر میں پیدا ہوتا
 ہے۔ اس کے باشندوں کے پاس بھی کوئی قوت نہیں ہے، نہ ذہنی

قوت، نہ سیاسی طاقت، نہ علمی زور، یعنی جن قوتوں پر قوموں کی تعمیر
کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک سے خالی ہیں۔ نہ وہ آئین رکھتے تھے، نہ
دستور، نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ نہ ان کی جماعتی پرانگیوں
کا کوئی شیرازہ بند، نہ ان کے پاس مکاتب تھے۔ نہ مدارس نہ کارخانے
نہ فیکٹریاں کچھ نہیں، ان چیزوں میں سے ایک نہیں۔ جس میں داخل
ہو کر کوئی بچہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ ان کے پاس جو جسمانی طاقت
تھی اس کا مصرف بھی بجز اپنی تعداد گھٹانے کے اور کچھ نہ تھا۔

اسی ملک میں، اسی شہر میں اسی قوم میں ایک بچہ کا ظہور ہوا اور
اس شان کے ساتھ ہوا کہ اس کے سر پر جو قوت بھی سایہ فگن ہو سکتی
تھی یا ہوتی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے مٹا دی جاتی تھی۔ یہاں تک
کہ آخر میں ہوا کہ وطن پر جو اسے بھروسہ ہو سکتا تھا۔ اس بھروسے
کو بھی ہٹا دیا گیا۔ برادری والوں میں جو اعتماد ممکن تھا۔ وہ بھی ناممکن
کر دیا گیا۔ یعنی سارا وطن، وطن والے، قبیلے والے، کہنے والے سب اس
کی دشمنی پر متفق ہو کر آمادہ ہو گئے۔ اور وہ جس کے پاس نہ باپ کی
قوت تھی اور نہ ماں کی، نہ دادا کا زور تھا، اور نہ کسی کا۔ نہ حکومت کی
سرپرستی اسے حاصل تھی۔ نہ مدرسوں کی تعلیم سے وہ فیضیاب ہو سکتا
تھا نہ اپنے ملک کے گروپیش کے خنک آئین اثرات سے اپنے دماغ
تازگی اور اس میں بالیدگی پیدا کر سکتا تھا۔ اب اس کے ساتھ یہ بھی کہا
گیا کہ گھر والے، کہنے والے، قبیلے والے وطن والے سب کے سب

اس سے پلچدہ ہو گئے۔ پاوہ ان سے پلچدہ کر لیا گیا۔ اور اب جا کر یہ
ارادہ پورا ہوا دیکھو!

”اس کے پاس کچھ نہیں ہے“

وہ ساری قوتیں جن کو لوگ قوت کہتے ہیں۔ اور جن کا نام محسوس
پرستوں کی اصطلاح میں ”قوت“ ہے ”زور“ ہے ایک ایک کر کے الگ
کر لیا گیا۔ اس کے بعد دیکھا گیا۔ شاہدہ کرایا گیا کہ۔

”جس کے پاس کچھ نہیں ہے دیکھو! کہ اس کے پاس سب کچھ ہو گیا
ایک منظر وہ تھا اور دوسرا منظر یہ ہے کہ وہ زمین کے ایک پڑ سے
قطعہ کا مالک ہے۔ اس کے خادموں سے پیچھے اگر کوئی درجنہ ہو سکتا
ہے۔ وہی قیصر کی ٹوپی اچھال ہے ہیں۔ کسر اس کے جلال و جبروت
کے پرزے اٹا رہے ہیں۔ وہی جس کے پاس کچھ نہ تھا۔ کیا دنیا
نے نہیں دیکھا۔ یا نہیں دیکھ رہی ہے۔ یا نہیں دیکھے گی۔ کہ وہی
دنیا میں سب سے بڑا قرار پایا۔ قوتیں اس کی تقدیس میں مصروف ہیں
نسلیں اس کے سر اٹھتے ہیں منہک ہیں۔ اقلانستان کی پہاڑیوں
میں، مراکو کی واویلوں میں، مصر کے ایوانوں میں۔ ہندوستان کی بسنتوں
میں چین کی آبادیوں میں۔ افریقہ میں، ایشیا میں، یورپ میں۔ امریکہ
میں کون ہوا؟ آتما بڑا کون ہوا؟ صرف ہمارے پاس نہیں۔ ہماری تاریخ
میں نہیں دوسروں کی تاریخ میں کیا اس سے بھی انسان نسل اول میں

کوئی ظاہر ہوا۔ ناموں و ہارون کو کس کی غلامی پر تھا۔ صلاح الدین
کس کے نام پر صلیب والوں کی بھیڑ میں لرزہ ڈالتا تھا۔؟
محمود کس کی جویش کے صدقے میں مشرق کا اولوالعزم فاتح قرار
پایا۔ شاہجہاں کس کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا۔؟ عالمگیر کس کی نگہ
کرم کے لئے دکن سنگتازوں میں ساہا سال تک ٹھوکر پی کھاتا پھرتا
تھا۔ یہ کس کی سہنائی کی برکت تھی کہ اناطولیہ کا ترک قسطنطنیہ کی
دیواروں کو پھاند گیا۔ یہ کیا تھا؟ اس لئے دعوائے کیا تھا۔ اور یہی
اس کی زندگی کا مقصد تھا کہ محسوس قوتوں کا انکار کرے۔ اس نے
دعوائے کیا۔ اور نہایت بلند آہنگی سے دعوائے کیا۔ اور خود اس
کی دلیل بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ کیونکہ قیاسی حجٹوں کا زمانہ نکل چکا
تھا۔ مشاہدات اور تجربات کا وقت آ رہا تھا۔ پس اس عہد
کے جو پیشوا تھے صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دعوائے بھی تمہینی
مقدمات سے نکالے ہوئے نتائج پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ گھلا ہوا تجربہ صاف
اور واضح مشاہدہ پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی۔ دنیا نے دعوائے کو سنا
دلیل کو دیکھا پھر ان میں سے کس کے ہوش قائم رہے۔ کلیسا میں
تزلزل پیدا ہوا۔ لوگ نے ایک ضرب شدید سے پونی تنظیم
کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ اور خود بنایا نہیں۔ لیکن قصر تثلیث کے
اصم حصہ کو اس نے اپنے صاف حجٹوں پر یاد کر دیا۔ کیا
کوئی اس کا منکر ہو سکتا ہے کہ تثلیث کی یہ جزئی شکست

اسی دعوے اور دلیل کا نتیجہ نہ تھا۔ جس کی امتداد، عرب سے
 ہوئی۔ اور کیا ان ہی میں جو یونٹیٹی پر آج خطبہ دے رہے ہیں
 وہ عالم کے اس سب سے بڑے انسان کے احسان سے
 سیکریشن ہو سکتے ہیں، شراب پر احتساب قائم کر نیوالو! دیکھو
 حق سے آنکھیں بند نہ کرو، شکرستان میں کبیر کیوں پیدا ہوا
 ٹانگ کس دباؤ سے بے چین ہوا۔ رام موہن رائے کس کی گرفت
 سے مضطرب تھا۔ اور آج ہندوستان کے طول و عرض میں جو وہ
 جماعت نظر آتی ہے، جسے اسلام سے عداوت کا دعوے ہے، لیکن
 اسی کے ساتھ وہ مسخنی ہیں بھی مصروف ہے۔ کیا اسراہلی
 فرما بڑوار ذہنی نافرمان کرنے کو اس دعوے کے اثر سے
 آزاد کہہ سکتے ہیں

لیکن اثبات دعوے کا یہ ایک ایجابی پہلو تھا۔ یعنی اس
 وقت تک یہ دکھایا گیا کہ

”کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا۔“

مگر اثبات دعوے کا دوسرا رخ ابھی تشنہ تھا۔ ایجابی پہلو
 کا مشاہدہ ہو گیا۔ اور کابل طور پر لیکن اسی کا سلیسی پہلو یعنی
 ”سب کچھ تھا اور کچھ نہ ہوا“

دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی حاشہ کرا دیا جاتا۔ تو پھر غیبت نامہ ہوجاتی
 شک دریبی کی گنجائش باقی نہیں رہتی، ایجابی پہلو کا مشاہدہ

تم نے مکہ کی وادی میں کیا۔ اب آؤ، کربلا میں آؤ اور دیکھو کہ اس
دعویٰ کی دلیل کا سبلی طور پر کس طرح مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔

شمس قوتوں میں سب سے بڑی قوت سلطنت کی ہے ہم
جس رقبہ کے بادشاہ ہیں۔ اس علاقہ میں سب سے بڑی قوت والا
کون ہو سکتا ہے۔ اور بادشاہوں سے تو رعایا کے کسی نہ کسی ذریعہ کو کچھ
نہ کچھ خصومت بھی ہوتی ہے، یہ قوت اس قوت اور بڑھ جاتی ہے
جب شاہی کے بجائے شاہزادہ کا طرہ میرے سر پر اہرا رہا ہو۔ کہ شاہزادہ
رعایا کے لئے مایہ امید اور بضاعت توقعات ہوتا ہے۔ ہر شخص
اس کی خوشامد میں اس لئے متہک ہوتا ہے کہ آئندہ چل کر اس
کی نگاہ کرم کا وہ مورد بنے۔ لیکن شاہوں کے شاہزادوں کی حکومت
تو صرف اجسام پر ہوتی ہے۔ اس پر یا مرشد کی قوت کا کون اندازہ
کر سکتا ہے۔ جو لوگوں کے جسموں پر نہیں۔ بلکہ قلوب پر حکومت کرتا ہو
اور پیری کا درجہ اس وقت کس قدر بلند ہو جاتا ہے۔ جب وہ نبوت
کی شان میں ظاہر ہو۔ یہ دنیا کی چوٹی کی تہیں ہیں۔ جنہیں ہم زور کہتے
ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی طاقت ان طاقتوں سے بالاتر نہیں،
پھر اس شخص کی قوت کو سوچو جو شاہزادہ بھی ہو اور دنیا کی سب سے
بڑی سلطنت کا شاہزادہ ہو، کیونکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس
وقت بقول جرجی زیدان کرۃ زمین پر سب سے بڑی قوت دو ہی تھیں
رومی دولت اور ایرانی سلطنت، جس قوم نے ان دونوں قوتوں کو

توڑ دیا۔ اس سے ساری زمین کی قوت توڑ دی۔ اور اس لئے کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں اسلام دنیا کی سب سے قوت تھی۔ وہ اسی سلطنت کا شہزادہ تھا۔ جہاں باغی رہتے تھے۔ وہاں جاتا تو شہہ کی گنجائش تھی۔ وہ شام نہیں بلکہ عراق آیا۔ جو اس کے پدر بزرگوار کا پایہ تخت تھا۔ کوہوں کے پاس آیا۔ جو اس کے والد کے نمک خوار سپاہی تھے۔ اور صرف شہزادہ نہیں بلکہ وہ ان کا پیر زادہ بھی تو تھا۔ کیا ان میں سے ہر ایک اس کے والد کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی پیشوا نہیں جانتے تھے؟ کیا ان کی والدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی نگاہوں میں سیدۃ النساء العالم نہیں تھیں؟ اور صرف پیر زادہ ہی تو نہیں۔ وہ ان کا بنی زادہ بھی تو تھا۔ اور کیا بنی زادہ کو اس کے جبرائیل صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ان کے قلوب میں کسی مخلوق کی عظمت کی گنجائش نہیں کھتی۔

الغرض امام حسین علیہ السلام جس وقت کربلا تشریف لائے ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت وہ شہزادے کی بجائے پیر زادے بھی تھے۔ بنی زادے بھی تھے۔ اور خود ان کے تقویٰ و دروغ زہد و صفا کی عام و صفا کربلائے اسلام پر قائم تھی، ان قوتوں کے ساتھ وہ آتے ہیں، اور اپنے والد کے پایہ تخت میں آتے ہیں، اپنے والد کی فوج میں، ان کی پھاؤنی میں آتے ہیں، سوچنا چاہیے کہ قوت کی اتنی جہات کسی ایک شخصیت میں آج تک جمع ہونی ممکن یا ہو سکتی

ہیں؟ میں نے معمولی پیرزادوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ اس شہر یا اس گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں اس کے والد کے کل باشندے نہیں بلکہ بعض لوگ مرید ہوتے ہیں۔ تو پھر ان کو ان مریدوں کی قوت پر حیرت ہوتا ہے۔ شاید شہزادوں کو بھی اپنے مالک خروسہ میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں شہزادگی بھی ہے۔ پیرزادگی بھی ہے، اور نبی زادگی بھی ہے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی قوت کی طرف سے یہ امتیازات قدرتی طور پر ان کو حاصل ہیں۔

الغرض عالم خصوصیات میں جو کچھ ممکن ہے۔
"سب کچھ ہے"

مگر اثباتی دعویٰ کے اس تجربی پہلو کا مشاہدہ کرو۔ جس کا نام میں نے "سلبی شہادت" رکھا ہے کہ باایں ہمہ قدرت و قوت زور و طاقت دنیا نے دیکھا، آسمان نے دیکھا، زمین نے دیکھا، اور قیامت تک دیکھتی رہے گی۔ کہ

"کچھ نہ ہوا"

امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے، ان کی نعش مبارک پامال ہوئی، ان کا سر مبارک کاٹا گیا، جس سے کہ محسوس قوتوں عقلی و سبیلوں خود ساختہ ذریعوں کو انام حسین علیہ السلام کے پاک خون نے جس طرح دھو کر ناپید کیا کسی نے نہیں کیا۔

اے شاہی جلال! تو بھی بے کار ہے، اے شہزادگی تیرے اندر

بھی کچھ نہیں۔ اسے پیرزادو سوچو! ان بستیوں میں پہنچ کر سوچو!۔
 جہاں تمہارے خاندانی مرید کہتے ہیں۔ کہ ان کی شوخس توڑوں کی تہ
 میں نفی اور عدم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو قوت شوخس ہو رہی ہے۔ وہ
 کچھ نہیں ہے۔ اور جو نہیں شوخس ہوتی وہی سب کچھ ہے۔ لا حول ولا
 قوۃ الا باللہ! تو فی الملک من تشاہد و تنزع الملک من تشاکے
 دعاوی کا اثباتِ علی اور تجرئی شکل میں مانا علی اللہ علیہ وسلم نے اپنی
 ابتدائی زندگی سے دیا۔ اور تو اسے علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری
 لمحوں میں بھی صرف اسی کا مشاہدہ کرایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ
 علیہ نے یہ غلط لکھا ہے کہ جو "صورۃ" کسی کے ساتھ مشاہدہ ہے۔ وہ
 متناہی اسی کے فرائض کی تکمیل کر کے دنیا سے روانہ ہوا۔ اللہم
 صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم
 انک حمید مجید!

اہمیت کبریٰ
 تھیل علیہ السلام نے بھی قربانی دی تھی۔ سچے کی
 قربانی دی تھی۔ اور بلاشبہ ان کی قربانی کا
 نتیجہ لیکن پھر بھی اس کا اثر باطن سے ظاہر تک پہنچا ہوا۔ دیکھو
 اس کے صلہ میں جو انعام انہی جاہلک الناس الاما کے ذریعہ سے
 شکل "اہمیت کبریٰ" عطا ہوا اس میں بھی ظاہر کی شان کے
 بتایا ہے سچ ہے کہ عیسائی، یہودی، مسلمان جو دنیا کی سب سے بڑی
 مشہور قومیں ہیں۔ وہ اپنا حق کو اپنا امام مانتی ہیں، اور پارسیوں کی

دعوائے ہے کہ ان کا وحشور اول و پیغمبر اول (وہ شخص تھا جس نے خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مدہشی پرآہا تھا۔ اسی کے منہ سے جو بات نکلی ہم اس کو دید کہتے ہیں۔ جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا پرآہا وہی ہے۔ جسے تورات میں ابراہام اور ابراہیم کو قرآن میں ابراہیم سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور صحف ابراہیم جن کا سرخ قرآن سے ملتا ہے۔ جس شکل میں تورات و انجیل و زبور سے نہیں ممکن ہے کہ ترجمہ ہو کر دید کی مشوخ و مشوخ شکل میں وہی صحیفے موجود ہوں۔ اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو مورخ کے لئے یہ کس قدر مشکل ہے۔ یہ حد کی تعلیمات کا سرچشمہ دید کو قرار دے۔ بہر حال مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا اثر باطن سے ظاہر تک شہد می نہ ہو سکا۔ اس لئے ان کی امامت میں بھی ظہور کا رنگ بہت ہلکا رہا۔ جو ان کو مانتے ہیں۔ وہ براہ راست نہیں مانتے اور جو نہیں مانتے، دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید ان کو ہی مانتے ہیں۔ یہ تو مہنی کی قربانی کا اثر تھا۔

پھر جو قربانی کربلا میں ہوئی۔ وہاں باطن نے ظاہر کی حقیقت نے مجاز کی شکل میں ظہور کیا۔ سینڈھا نہیں بلکہ خود امام حسین علیہ السلام ذبح ہوئے۔ خدا کے سامنے ذبح ہوئے۔ اس کی ساری قوتوں کے سامنے ذبح ہوئے۔ چہرئیل و امیرائیل کے سامنے ذبح ہوئے۔ ملائکہ روحانین

اور ارواحِ مقربین کی آنکھوں کے نیچے ذبح ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ذبح ہوئے۔ دوسروں کے ہاتھ سے نہیں اپنے ہاتھوں کی امت کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان نکات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ پیر نہ کیوں کے پاس حضرت حسین کی شہادت کے لئے کوئی تیرو نہ تھا۔ قادیسیہ کے کافروں کی لکر میں اس فضیلت تک پہنچانے کے لئے کوئی شہر نہ تھا۔ کیا مصلحت تھی جن کے حکم کے سوا اور کوئی کسی کا حکم نہیں۔ اس کی کیا مرضی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند علیہ السلام ذبح ہوں۔ اور ان ہی کی بنائی ہوئی جماعت کے ہاتھوں ذبح ہوں۔ تاریخوں میں جو یہ فرقہ ہے کہ جب امام علیہ السلام نے دریافت کیا کہ دشمنوں کا کیا حال ہے۔ تو بالاتفاق آپ کو یہ خبر سنائی گئی کہ "اے امام! قلوب آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہاتھ آپ کے خلاف ہیں چلیں گے۔"

بچل اللہ ما یشاور حکیم باہر پید کی حکمت مطلقہ میں جو سوچتے ہیں۔ وہ پاتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دل اپنے بچہ کو ذبح کرتے وقت مضطرب نہ تھا۔ اگر مضطرب نہ تھا۔ تو پھر ان کے لئے اجر کیا تھا؟ مضطرب ہوا اور نہ مضطرب ہو۔ ساری بنیاد اسی

سے اس کے متعلق شاد عبد العزیز صاحب نے سر الشہادتیں میں مشدد و درمیش پیش کی ہیں۔ اور اس کی تہنق کی ہے۔

پہرے۔ ورنہ گلے اپنے جوان سپکے کو جسے وہ پہچان بھی نہیں سکتی۔ اگر اس نے اپنے سینگ سے مار ڈالا تو اس کے لئے کیا اجر ہے۔

پھر حال کر بلا میں جو قربانی دی گئی یہی ایک ایسی قربانی تھی جو باطل سے منتقل ہو کر ظاہر کے پردہ پر جلوہ پرداز ہوئی جو اندھ تھا۔ وہ باہر بھی آگیا۔ حقیقت نے مجاز کو بھی حقیقت ہی کے رنگ میں رنگین کیا اسی کو کہا جاتا ہے کہ اس قربانی والی امت کبرے جیسا کہ باطن میں عام تھی۔ نام تھی۔ اسی طرح ظاہر میں بھی عام ہوئی، نام ہوئی۔ اس امامت والے امام کو کافرتہ للناس بشریٰ و نذیرا کی سند دی گئی۔ تاکہ سب جانیں سب جانیں۔ اور پھر اس سند پر ختم نبوت کی ہر لگائی گئی۔ تاکہ براہ راست جانیں، براہ راست جانیں۔ درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہ ہو، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت کی شناخت میں لوگ واسطہ و ذرائع کے محتاج ہیں۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے، عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے، مسلمانوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی امامت کے آگے گروہیں ختم کیں لیکن اس امامت کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کسی ذریعہ کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد واسطوں کی پیدائش ہی بند کر دی گئی۔ اگرچہ اس کا تصفیہ کون کر سکتا ہے کہ ابراہیم کے نسب زندا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو امامت ملی۔ کیا وہ بھی اسی امامت کی ایک نشانی نہ تھی جس کی بشارت ابراہیم کو دی گئی۔ جو بیٹے کو ملا۔ کیا وہ باپ ہی کو

نہ ملا۔ پھر اسی طرح ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کرطا میں جو شہید ہوا۔ وہ بھی اسی ذبح کا ایک جزو تھا۔ جس کو بننے کے گوشے میں ذبح کرنے کے لئے خلیل علیہ السلام نے پچھاڑا تھا۔ اسماعیلؑ نہیں شہید ہوئے۔ تو حسین علیہ السلام جو اسحاق کے نہیں اسماعیل ہی کے بچے تھے۔ کیا ان کی شہادت کو اسی مبتداعہ کی ہم خبر کہہ سکتے ہیں؟ عازفوں کے لئے ان اسرار میں کتنے لہزائے ہیں؛ جو پھل پیا کرنے کے لئے صمد سے آب خرے اڑاتا ہے۔ بادلوں کو جنبش میں لاتا ہے۔ مٹی کو لکڑی اور پتے اور آٹریں پھول کی شمس میں نمایاں کرتا ہے۔ جو آدم کو خلیفہ بنا سنے کا ارادہ پہلے کر لیتا ہے۔ اور ایک الزام سے فارغ بنا کر اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کیا کرتا ہے۔ اور کن کن اغراض کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔

مصلحت نیت کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رزداں خبر سے نیت کہ نیت

جس کے ابوبین صالح تھے۔ موسیٰ و خضر کو حکم ہوا کہ ان کے خزانہ

کی حفاظت کریں۔ تاکہ باپ کی چھینٹ سے بچ سکیں۔ یہی ہوتا

۱۶ سورہ کہف میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے جب منہدم دیوار کو بشیر مزدوری کے اٹھایا اور موسیٰ مسترین ہوئے۔ تو انہوں نے جو اربابیں یہی منہرایا۔ کہ دکان تھو کتر الہاد دکان

الابہا صالحا

رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

نہ تھا نیل کا جبار کچھ نہ تھا " اس میں " ہونے " کی

رہائش نمائش ہوئی، وجود بلا، وجود کے لوازم ملے، زندگی

لی۔ قوت دیدلی، شنیدلی، چشیدلی، سمیدلی۔ گوشت اور ہڈی

کے مرکب میں ان طاقتوں کی جلوہ نمایاں شروع ہوئیں۔ ان کی پیٹھ

مضبوط کی گئی۔ اس کے بازو میں زور بھرا گیا۔ اس کی زبان میں

کہربانی اثرات دوڑا دیے گئے۔ وہ افریقہ کے اس سرسبز گوشہ کا سور

قرار پایا۔ اس نے سونے کا تخت بچھایا۔ اور اس پر بیٹھ کر اس نے

مخسوس کیا کہ ملک مصر کی گردن اسی کے ارادہ اور مرضی کے

نقاط پر ہوتی ہے۔ یہ کیا احساس تھا کہ اس نے اس کے دماغ کو لٹ

دیا ہے جو کچھ دیا گیا۔ وہ محض بدامانت میں دیا گیا تھا۔ نظام و ماعنی

کی معکوسی اثر کا اندازہ کرو، کہ وہ بیکار یہ باور کرنے لگا۔ کہ اسی نے

سب کو دیا ہے اور اس کا دینے والا کوئی نہیں ہے۔ خود فراموشی نے

خودی کا رنگ اختیار کیا اور خیانت کے جنون میں بدست ہو کر وہ

انارکیم الاعلیٰ بڑ بڑانے لگا۔ جو ایک سکند کے لئے بھی اپنی ذمہ داری

پر اپنے پیچھے کھینچنے کو بلکی سی سانس نہیں دے سکتا تھا۔ ایک بڑے

ملک کے باشندوں کا۔ ان کے کھانے پینے، سونے جانے مرنے پینے

تفع نقصان کا ذمہ دار بن بیٹھا۔ اور اپنے کو ہر قسم کی ذمہ داری سے

اس نے بالآخر قرار دیا۔ اس کی شخصیت پر وہی آسب مسلط ہو گیا

تھا۔ جو آج کل بنی آدم کی بعض نسلوں کا گلا پکڑے ہوئے ہے۔ وہ
 انفرادی فرعون تھا۔ اور آج کرۂ زمین پر اجتماعی اور قومی فرعون کا
 پروژہ ہو رہا ہے۔ پہلے اس اثر دہے نے نیل کے پانی سے سر نکالا تھا
 اور آج افراد کو مٹا کر ذرا زیادہ شدت کے ساتھ جمہوریت کی شکل
 میں پیڑ اور سین کے کنارے گرج رہا ہے۔ دونوں کی اسپرٹ ایک
 ہے۔ سانچوں اور قالبوں کے اختلاف پر اتنا زور نہ دیا کرو، اس کی
 شکایت نہیں ہے کہ انٹین وجود کیوں بلا؟ ان کی نسبتی ہیں سستی
 کی منور شعاعیں کیوں چمک رہی ہیں۔ ان میں بنیانی شنوائی کے
 مظاہر کا ظہور کیوں ہوا؟ زمین پر ان کا رعب کیوں قائم ہے، باقی اذ
 مالی نقصان کے خوف سے دنیا والے ان کو اپنی آمدنی کے ایک
 حصہ کو دینے پر کیوں مجبور ہیں۔ یہ خوف بن آلات واسلہ کے زور
 سے پیدا ہوتا ہے، وہ ان کو کیوں لے۔

آخر ہم اس کا گلاہ کیوں کریں؟ کیا ہم دینے والے کے ملک میں سا جھی
 ہیں۔ یا اس کا ہم سے کوئی نا طیبہ ہے۔ ہم پر اس کے حقوق منسور ہیں
 لیکن اس پر کون حق قائم کر سکتا ہے۔ اس نے تمہارا کیسا دبا
 جو تم اس طرح روٹتے ہو اور آنکھیں بسورتے ہو۔ اپنی چیز دی ہے۔ اپنی
 دوست دی ہے۔ اپنا ساز و سامان دیا ہے۔ کیا واقعی ہمیشہ اس کی
 مصالحت وہی ہوتی ہے۔ جو اس نادان بڑھئی کے نزدیک تھی اور
 کہتی تھی۔ "لے خدا ایٹھے دے اور میرے پیٹے کو! لیکن کیا دوسروں

کے لئے تو عرض کرے گا۔

ہم جس پر منتخب ہیں۔ اور تعجب کبھی غصت کی اور کبھی تعصب کی کبھی عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ یہ دیوانے اپنے کو، اپنے علمی و علمی ذخیروں کو اپنا کیوں سمجھتے ہیں۔ امانت میں حیانت کیوں کر رہے ہیں۔

جرم سے انسانی فطرت بیزار ہوتی ہے۔ چور کو کون دوست رکھتا ہے۔ ڈاکوؤں سے کسے عداوت نہیں۔ خود جرم بھی تو اپنے جرم سے راضی نہیں، اپنے جرم کے وصف عنوانی سے موصوف ہونے کو اپنی امانت خیال کرتا ہے۔ جو زانی ہے اس کو زانی کے خطاب سے مخاطب کرو۔ اور بشری جذبے کی طبعی مدافعت کا اندازہ کرو۔ کم از کم اپنی حافظت کے لئے تم کو تعمیر کے بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ جس طرح آج یورپ قبائح و سہیات کی حرارت کو محاسن و حسنات کے خوبصورت عنوانوں اور تعبیروں سے ٹھنڈی کرتا ہے۔ پھر اگر ہم خائنیوں سے کڑھتے ہیں۔ ان کی ہر حرکت و سکون سے ہمیں نفرت ہے۔ تو کیا سلیم فطرت اس کے سوا اور کچھ بھی کر سکتی ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے ہم سے ہمارا ملک لیا ہے۔ ہماری دولت لی ہے۔ ہماری شوکت لی ہے اس لئے ہم ان سے بیزار ہیں۔ جو ملک کو اپنا ملک اور دولت کو اپنی دولت سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دوسرے سے اسی لئے چڑھتے ہیں۔

لیکن ہم سے تو ترکوں نے، پھانوں نے، مغلوں نے اور
خدا جانے کن کن لوگوں نے دولت بھی لی، سلطنت بھی لی، سب
کچھ لیا، پھر کیا ہم سے کوئی ان سے اس وقت تک بیزار ہوا جب
تک کہ ہم نے اپنے کو اپنا نہیں سمجھا۔

بہر حال میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ میری غرض تو یہ تھی۔ کہ مصر
کے محدود رقبہ میں جس کے پس پشت قوت کی نمائش ہوتی تھی
اور جس کے غلط انتساب نے غلطیوں کا اسباب قائم کر دیا تھا۔ کیا
تماشہ ہے۔ وہ اس کو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یکایک
سب کی سب واپس لے لی گئی۔ پانی کے باہر اس کا سب کچھ تھا۔ مگر
چند قدم فاصلہ سے پانی کے اندر اس کا کچھ نہ تھا۔ اور

اور کئے باغ کئے سرچشمے۔ اور کئے پر	کند ترکو۱ من جنت
شکادہ بنگلے اور وہ ساری نعمتیں جن	وعیون و ذروع و حوامقار
میں وہ فرسے کے سمے تھے۔ - چھوڑ	کریم و نعمتہ کا نور
بیٹھے۔	فیہا تا کہین!

ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اس نے صاحب امانت کی طرف
خود نہیں لٹایا۔ بلکہ اس سے زبردستی یہ چیزیں چھینی گئیں۔ پھر کیا
اس دردناک سانحہ پر کوئی رویا۔ کسی کے دل میں افسوس کا جذبہ اکتھبہرا
ان پر کسی نے اٹھو بہا ہے۔ اللہ کے لئے کوئی چہنچا؟ یہ سچ ہے کہ آج
ہو اس کے گدی نشین اور اس کے دامغانی مرض کے وارث ہیں۔ وہ

اس کی اور اس کے آباؤ اجداد، اس کے امراء اور اس کے وزراء کی قبروں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو جو زندہ اجسام کی اعانت کے لئے دی گئی ہیں۔ وہ مردہ لاشوں کی تلاش میں صرف کر رہے ہیں۔ مصر میں مردوں کو ٹھولا جاتا ہے اور زندگی کی گردنیں مروڑی جاتی تھیں۔ اور جس طرح لوح و ابوابِ موسیٰ و عیسیٰ کے وارثوں نے اپنے بزرگوں کے نام بلکہ کامیاب مسمورہ عالم کو بھر دیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی چاہتے ہیں۔ کہ ان گنہ گاروں کو مورتوں کے سیاہ کارناموں کو علی الرغم روشن کریں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بڑے تزک و احتشام سے ہو رہا ہے۔ لیکن حذر! یہ تناؤ! کہ ان میں سے ان ڈوبنے والوں کی لاشیں پر کون رویا۔ ان کی اونچی محل سراؤں پر کون آب ویدہ ہوا۔ ان کی فراواں دولت کے ڈھیر پر کس نے دھاڑیں ماریں! تم دیکھو یا نہ دیکھو! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے بزرگوں کی لاشوں سے پر ہاری کے بندروں کا کام لیتے ہیں۔ میوزیم میں رکھتے ہیں۔ ٹکٹے لگاتے ہیں۔ پیسے وصول کرتے ہیں۔ ان کے کفن کے سائز و سامان کے چرانے میں ایک دوسرے پر کتے کی طرح غارتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خائن مجرم تھا۔ مجرم نے جرم کی سزا پائی پھر اس پر کون رو سکتا ہے۔ صدیق مولانا اللہ کریم

پھر نہ ان پر آسمانوں

نما بکت علیہم

السما والارض گریہ کیا۔ اور نہ زمین روئی۔

(حق سبحانہ تعالیٰ)

لیکن اس کے مقابلے میں جو فرات کے ساحل میں آیا۔ اپنے
 کو لے کر آیا۔ اپنی آنکھوں اور کانوں کو لے کر آیا۔ اپنی قوتوں کو لے
 کر آیا، اپنے تمام اعضا کو لے کر آیا۔ اپنے بال بچوں سمیت آیا۔ اپنی
 عزت و آبرو اپنے ناموں کو لے کر آیا۔ اپنی شاہزادگی کی طاقت،
 پیرزادگی کے اعزاز کو لے کر آیا۔ اپنی زادگی کے جلال کو لے کر آیا۔ بلکہ
 خود اپنے زہر و قہر کے ولایت و کرامت کی قوتوں کو لے کر آیا۔ زہرتی
 نہیں بلکہ راستی سے آیا۔ خوشی سے آیا۔ روکنے والوں نے روکا
 لیکن وہ بے تخاصہ روایات کے لئے امتحان کے میدان میں جا پہنچ
 سکے و نکل میں اتر گیا۔ کیا وہ شامیوں کے فخراتی تخت کے لئے اتر ا۔
 نیا امیہ کے پاس مٹی کی بالائی سطح کا جو چھلکا تھا۔ کیا وہ اس کے
 لئے آیا۔ کیا واقعی اس کے سامنے ابن زیاد و نفا۔ یا یزید کا سپہ سالار
 تھا۔ لوگ کچھ ہی سمجھیں لیکن ہمارے ذہن نے دیکھا تھا۔ اور جیسا کہ تاریخوں
 میں بھی ہے کہ وہ صعب جنگ میں

• لا الہ الا اللہ سبحان اللہ و بحمدہ •

کا نعرہ لگا رہا تھا۔ پس کون جان سکتا ہے کہ کس لئے آیا تھا؟ اور
 کس کے سامنے آیا تھا۔ اور یہ لین دین کن دو ہستیوں کے درمیان تھا
 اس پر پانی بند کیا گیا۔ اس کے تشک ہو نہ سکا، سو کھنی زبان اسکی کب

تھی جو پرواہ کرتا۔ اس سے اعزہ سے گردنیں مانگی گئیں۔ اس نے واپس
 کر دیں اس سے ننھے بچوں کا خون طلب کیا گیا۔ اس نے حاضر کر دیا
 اس پر تیروں کی بارش ہوئی۔ اس نے قبول کر لیا۔ اس کا جسم چھپا
 گیا وہ دم بخود کھڑا رہا۔ اس کے جسم پر تلوار کی دھار مار می گئی۔ وہ سر
 جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے سر سے گردن الگ کر دی گئی۔ اور اس
 غذا کے سامنے الگ کی گئی۔ جو اس کے ساتھ تھا۔ پھر کیا اس نے
 انکار کیا؟ اس کے گھر کا ادائے خادم معنول ملائکہ تھا۔ فہیرہ بن مالک
 کی لاش کو ملکوت والوں نے چھپا لیا۔ لیکن اسی گھر کا جو سردار تھا۔
 اس کی نعش مبارک پر گھوڑوں نے ٹاپ مارے۔ اس کی ہڈیوں کو
 کچلا۔ اور آسانی کے ساتھ یہ مراحل طے ہو گئے۔ آخر میں اس کی عزت
 و ناموس پر بھی حملہ کیا گیا۔ اس کے گھر کی خاتونوں کو جنت کی خاتون
 کی لخت جگر تھیں۔ ان کو رسیوں میں باندھا گیا۔ زمین پر گھسیٹا گیا
 اور یوں اس کو جو کچھ دیا گیا۔ ہنستے ہوئے چہرے۔ مسکراتے ہوئے
 لبوں کے ساتھ اس نے سب واپس کر دیا۔ اور ان تولا مانات الی
 اہلہا کی ایک ابدی تفسیر حیرتہ عالم پر اسی کے بدولت ثبت ہوئی
 نہ اتنا کسی کو لا۔ اور نہ اتنا کسی نے دیا۔ کون اندازہ کرے اس
 شخص کی نعمتوں کا کون اندازہ کرے۔ جو خالق کے محبوب کا محبوب
 تھا۔ وہ اس کا پیارا تھا۔ اس کے کندھے پر کھیلنے والا تھا۔ اس کی
 پشت مبارک کا سوار تھا۔ اس کے لب ہلے اقدس کا وہ پورے گاہ

تھا کیا آفتاب اس کے حکم کا منظر نہ تھا۔ زمین اس کے آگے تھکی ہوئی نہ تھی۔ جبرئیل امین اس کے فرمان سے سر تابی کر سکتے تھے۔ فرات اس کا نہ تھا۔ تو پھر کس کا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے میدان کر بلا میں تلوار چلائی۔ پیرے کو جنبش دی۔ حالانکہ کیا کسی مستند تاریخ سے اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اس کی تلوار کی باڑھ کون کس جھال سکتا تھا۔ جب اس کے الفاظ کی پروا نہ تھی تو کسی کی صلاحیت کسی ہی نہ تھی۔ قاصم نے جب یا عم کسکر پکارا اور ضبط نہ ہو سکا تو کس نے نہیں دیکھا کہ قاتل کا گھوڑا اپنے سوار کو پیچھے سے گرا کر گھسیٹا جاتا تھا۔ اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی لاشیں پارہ پارہ ہو گئی۔

پھر حال نہیل کے کنائے فائن سے امانت چھینی گئی۔ پھر نہ اس پر آسمان رو دیا۔ اور نہ زمین روئی۔ اور فرات سے کے ساحل پر امین صادق نے امانت واپس کی۔ پھر دیکھو! اس پر دنیا روئی۔ قوموں نے ماتم کیا۔ لنگڑوں نے آنکھوں سے آنسو بہا سکے۔ صبر و امانت نے اس کے گوشہ گوشہ کو سمنا۔ قزاقوں میں اس کا گریہ و بکا گونج رہا ہے۔ افغانستان سے گراہ کی آواز آ رہی ہے۔ پورٹس ڈالوں کا دل پارہ پارہ ہے۔ ہندوستان کے اکثر شہر اور اس کی لسیٹیوں میں ہلکے پلٹے ہوئے ہیں۔ ایران کا کیچہ پھٹا رہا ہے۔ عرب کی آنکھوں میں بھی آنسو پھرے ہوئے ہیں۔

مصر کی بھی بے چین لگیا۔

العسکر جس سے امانت میں نجیانت کی تھی۔ اس پر لڑنے کے

جاہ و چشم پر، مال و دولت پر، نہ آسمان رو یا نہ زمین روئی اور جس نے
 امانت کو پوری قوت کے ساتھ، نہایت صفائی کے ساتھ بغیر کسی
 آلودگی کے واپس کیا۔ اس پر عرب و عجم سب کے سب مصروف گریہ
 و بکا ہیں صدیوں سے ہیں۔ قزاقوں سے ہیں اور اب تو اس پر مشرہ
 سو برس گذر چکے ہیں۔ یہ رونا نہ تھمے گا۔ یہ ماتم ختم نہ ہو گا۔

کون ہے؟ نسل انسانی میں کون ہے؟ جس پر آسمان زمین
 تو خیر آسمان و زمین جس کے لئے ہے۔ یعنی بنی نوع انسانی نے اس عزم
 کا اظہار اس طرح کیا ہو، کیا سب کسی پر اس طرح روئے، کیا عیسائی
 اپنے کسی شہید پر اس درجہ غمزہ ہوئے، کیا بدھ کے پیروؤں
 میں اس کی کوئی نظیر ہے۔ کیا یہودیوں کا کوئی شہید اتنا مشہور
 اتنا بلند ہے۔ کیا پارسیوں کی حد و جماعت کی کوئی تشریاتی اس
 احترام کی مستحق قرار پائی؟ پرانی تاریخوں میں بلاشبہ ایسے قسطنطیل
 نظر آتے ہیں جن کے خون کو دیکھ کر انسانی فطرت بہت مضطرب
 ہوتی ہے۔ اور کچھ دن کے لئے کسی مخصوص ملک کے کسی خاص علاقے
 میں ان آنسوؤں نے اضطراب کی شکل اختیار کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ
 اپنی وسعت زمانی و مکانی اتنی گہری اور عمیق غما کی کی تطلب تاریخ میں
 کون دیکھ سکتا ہے۔ اور یہی مراد ہے سر الشہادین میں حضرت شاہ
 عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی
 شہادت جہری شہادت تھی۔ اور اسی وجہ سے شہرت میں اتنا بلند

تبہ حاصل کیا

"خائن" کے متعلق جب قرآن مجید کا نص قطعی وارد ہے۔ مابکت
 لہم السما والارض " اور محل طعن و ملامت میں واقع ہے۔ تو کیا
 میں شخص پر آسمان و زمین سے بھی زیادہ گرامی ہستیاں روئیں۔ اس سے
 اس کی تعریف و تقدیس نہیں نکلتی؟

یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
 انا جری من خلق و جس نے مرے کے ماتم میں سر بند آیا اور
 صلق و خرق زور زور سے خنجا۔ اور کپڑے پھاڑے
 (بخاری و مسلم) میں اس سے بری ہوں۔

اور بلاشبہ حدیث میں ہے کہ :-

لیس من ضرب الخندود جو کلوں پر ٹپکے باز تاجہ ہر یا گریبان بھارت
 و شق الخیر و دعتا بیدا ہے یا جاہلیت والوں کی طسیرج بین کرتا
 عری الجاصیلید (بخاری) ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔
 پھر کیا ان حدیثوں کے بعد بھی میں ان نادانوں کی تاسیب کروں گا
 جو اپنے سینوں پر ایسے کی زنجیریاں ٹپکتے ہیں۔ یا اپنے ہال لہچتے ہیں یا
 مضرعی آوازوں کے ساتھ ایام جاہلیت کے دستور کے مطابق ڈھارے
 مائے ہیں۔ میں ان سے تم ہی کہوں گا۔ جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
 نے سعد بن عبادہ کی عبادت کے وقت صحابہ کرام کو مخاطب کر کے
 ارشاد فرمایا تھا۔

اَلَا تَسْتَعْتَبُونَ اِنَّ الشُّكْلَ لَا يَعْدِبُ كَمَا تَمَّ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ
 مِدَّ مَعَ الْعَيْنِ وَلَا يَحِزُّ اَنْكُحُوْنَ كَيْفَ اَنْتُمْ يَادُلُّ كِرَاهٍ بِرَسْمٍ
 الْقَلْبِ وَلَكِنْ يَعْدِبُ بِهَذَا كَرْتَا. بَلْ كَرْتَا اس كى سزا اس پر ہو اور آنحضرت صلی
 وَاشار الى الساعه و بخاری مسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا

مطلب یہ کہ پیچ پکار بین اور ہنگامہ نامسزا اور ناجائز امور ہیں لیکن
 دل کی رقت، طبیعت کے ہیجان، آنسوؤں کے سیلان کو کون روک
 سکتا ہے۔ بلکہ روکنے والے کو ذرا سنبھل کر سوچنا چاہیے کہ وہ

کہیں ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو تو نہیں چھوڑے ہیں
 بخاری میں ہے کہ جب ابراہیم ابن رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع
 طاری ہوا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے
 آنسو جاری ہو گئے۔ اس پر عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ نے
 دریافت کیا کہ رسول اللہ! آپ یا رسول اللہ! دوتے ہیں؟ آپ نے ارشاد
 فرمایا: انہما رحمتہ (یہ رحم اور تڑپ ہے) اتنا فریاد تھا کہ پھر آنکھوں
 سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روتے جاتے تھے اور
 فراتے جاتے تھے۔ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ دل غمناک اور ہم نہیں کہتے
 وہی جو ہمارے رب کی مرضی ہو۔

مخصوص دنوں میں اپنے گوروتے پر تم کیوں آنا دہ کرتے ہو۔ کیسا
 کر بلا کا حادثہ ایسا حادثہ ہے جس پر دل کی غم انگیزی کہی نہیں ہو سکتی
 ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ماہ محرم میں یہ واقعہ زیادہ یاد آتا ہے۔ اور یہ

قدرتی امر ہے۔ ممکن ہے اس موسم میں جگر کی ٹیس زیادہ بڑھ جائے
دل میں زیادہ شدت کے ساتھ ہوک لٹھے۔ اندرونی بے چینیاں بیرونی
آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیں۔ لیکن اس غم کے لئے دن کیوں بناتے
ہو۔ جو غیب محدود سوز کا طالب ہے۔ اس کو محدود بنا کر تنگ

کیوں کرتے ہو۔؟

اور میں تم پر کیا ملامت کروں۔ کہ اب تو ہمارے دشمن اور ان
دشمنوں کے سحر سے مسحور ہو کر خود ہمارے گھر میں ایسے لوگ ہیں۔ جو
اس چہری شہادت کو ستری بنانے کی فکر میں مصروف ہیں۔ بلکہ ان
میں کہتے ہیں۔ جو اس شہادت کو شہادت کے درجے سے گرا نا چاہتے
ہیں۔ وہ اب مشورہ سے رہے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو یہ نہ کرنا
چاہیے۔ اور ان کو یہ کرنا زیادہ مناسب تھا۔ پچھن سال کے بزرگ امام
حسین علیہ السلام تیرہ سو برس کے بعد ان پیشہ ور مورخین کے مشوروں کے
کس حد تک محتاج ہیں۔ اس کا تصفیہ خود ان کی عقل کر سکتی ہے۔

لیکن میں تو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی اسس نکتہ
شماں طبیعت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے سیر الشہادین میں لکھا
ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادت دراصل فضائل و کمالات کے
سلسلہ میں ایک اہم حقیقت ہے اور "نبوت کبرے" جو تمام فضائل و
کمالات کی آخری حد ہے شروع تھا کہ اس میں یہ کمال بھی شریک ہو۔ لیکن
منسوب نبوت کی شان عالی میں اس سے احتمال کا اندیشہ تھا۔ اس لئے

قدرت نے اس کمال کو بچائے باپ کے بیٹے کی طرف منتقل کر دیا شاہ
 صاحب نے صحیح حدیثوں سے امام حسین علیہ السلام کا نقطہ نواسہ ہونا نہیں
 بلکہ ابن بیٹا ہونا ثابت کیا ہے۔ اور عقلی طور پر اپنے اس دعوے کو اس
 سے مدلل کیا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام اپنے جسم کے نصف حصہ میں آنحضرت
 صلعم سے خلقت بہت زیادہ اترتے تھے۔

پس جو کمال بیٹے کو ملا، وہ باپ ہی کو ملا۔ کیونکہ گوانجیل میں ہے کہ جو
 کچھ باپ کا ہے وہ سب بیٹے کا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
 تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بیٹے کا ہے سب باپ کا ہے اور اس
 بنیاد پر شاہ صاحب کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جو فضیلت امام حسین
 علیہ السلام کو حاصل ہوئی، وہ دراصل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے
 فضائل میں داخل سمجھی جائے گی۔ بہر حال شاہ صاحب نے یہ گفتار صحیح اور قائم
 فرمایا ہے کہ "فضیلت شہادت سے منصب نبوت میں احتمال کا اندیشہ تھا۔
 میں دیکھتا ہوں کہ یہی فضیلت جب نبوت سے ہٹ کر امامت پر اور
 باپ سے ہٹ کر بیٹے کو ملی تو ہمارے دلوں میں دوسووں کے کتنے سمندر
 موج مارتے لگے خصوصاً آج کتنے ہیں جو اتفاقاً واقعہ کربلا کی اہمیت

سے یہ قانون اس حدیث سے پیدا کیا گیا ہے جس میں ہے "انت واکت لابیک"
 اور بعضوں نے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ تو اور میرا مال میرے باپ کا ہے۔ اور بعضوں نے
 کہا ہے کہ تو اور جو کچھ تیرا ہے میرے باپ کا ہے۔

کے گھٹانے کے لیے ہیں۔ اور ان میں ایسے بہت ہیں جو علانیہ کہہ سکتے ہیں۔ "جب حکومت و سلطنت سے مغلوب ہو کر کر بلا میں شہید کا خون بہا" "خاکم بدین" میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ اپنی خانگی صحبتوں میں اس کے جذبہ ضد اور ہٹ دہرمی کا ایک گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کو امام کی ولایت میں شہید پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان کی ملکوتی قوتوں کے متعلق اظہارِ تہذیب کرتے ہیں۔ وہ امام ہمام شہید علیہ السلام کے متعلق گراہی پھیلاتے ہیں اور ان اوہام و وساوس کی بنیاد کیا ہے؟ وہی فضیلت شہادت جو باپ کی جگہ بیٹے کو ملی۔ اگر امام حسین علیہ السلام کر بلا میں ان خصوصیتوں کے شہید ہوتے۔ تو ان وساوس کی کہاں گواہی ملتی؟

پھر غور کرو۔ اگر یہی شہادتِ خاص "ذاتِ نبوت" کے ساتھ نظر ظاہر ہوتی۔ تو ان ہمارے دل کے ایمان کا کہاں ٹھکانا تھا۔ اس وقت تک ان کو بیٹے کے عقل و اخلاق میں نقیض نظر آتا ہے۔ تو اس کی مراد وہ باپ کو بری کہنے پر قادر ہے، ان کی بربادی یعنی۔ اور کہیں بربادی تھی اور اب بھی وہ کب بربادی سے بچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے اعتراف کیا ہے۔ تو کیا وہ بھول گئے کہ درخت ان کی زبان کی پرچوں سے محفوظ رہا۔ پھل اور کیسا پھل، جس سے بول رہیں اللہ تعالیٰ کے انجوش میں پرورش پائی، حیدر گدار کی نگراہی میں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ جس کو دنیا کے سب سے بڑے پھیر علی اللہ علیہ السلام

ماں کی طرح پالا۔ اور باپ کی طرح نگہداشت کی۔ وہی جسے ابو بکر صدیق نے ہمیشہ پیار کے ساتھ وہ سب کچھ سکھایا۔ جو اس کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھاتا تھا۔ فاروق اعظمؓ کی توجہ جس پر اپنے بچوں سے زیادہ تھی ذوالنورینؓ کو جو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اور سارے صحابہؓ کی آنکھوں کا جو نور تھا۔ ان درختوں کی مجموعی قوت سے جو پھل پیدا ہوتا تھا۔ انہوں سے تم پر افسوس ہے کہ تم کو کسی اور کی غفلت میں تاریکی نظر نہیں آئی۔ کسی اور کے اخلاق میں ہٹ اور ضد کی کدورت تم کو معلوم نہ ہوئی۔ اور معلوم ہوئی تو کہاں معلوم ہوئی۔ تمہارے ریسرچ ورک و تحقیقی جاہدات کے لئے تو بڑا میدان تھا۔ پھر اسی وادی پر خار میں اترنے کی کیا ضرورت تھی۔؟

جس نے پچھن سال کی عمر رضا و تسلیم، خاموشی اور خمولت میں گزار دی۔ جس نے باوجود عمدہ گھوڑوں اور پر شوکت سواروں کے بارہا بلکہ پچیس دفعہ ڈھانی سو میل کی مسافت طے کر کے اللہ کے گھر کا حج کیا۔ جس نے تین دفعہ اپنی ساری مملو کات سے دست بردار ہو کر بے غامتاں ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ تم اس کے متعلق ایسے برے

۱۔ حافظ ابن حجر نے اصحابہ میں ان تعلقات کو واقعات کی روشنی میں دکھایا ہے۔ من
 ۲۔ شاہ قلیبراج الیہ علیہ علامہ شترانی نے اپنے طبقات میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔
 ۳۔ ایک سے زائد تاریخوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

پکائے ہو۔ فرات کے کنارے تو (العباد باللہ) وہ یزید کی دولت کو دیکھ کر آیا تھا۔ لیکن مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چھپیں وقتہ پیادہ یا کس غرض کو سامنے رکھ کر آتا رہا۔ اس کا کیا منصوبہ تھا۔ جب اس نے اپنی ماری جانیداد کو تین وقتہ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔

شاہی طاقت پہلے جسموں کو جھکاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا دباؤ عقل پر پڑتا ہے۔ عقلی ربودگی کے ساتھ ہی وہ بھی جھک جاتا ہے جس کے جھک جانے کے بعد ہر چیز جھک جاتی ہے۔ آخر جب دل ہی جھک جائے۔ تو اب آدمی میں کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے جو نہ جھکے جذبات، ارادت خیالات، حرکات و سکنات سب کے سب ان سیاسی بازیگروں کی انگلیوں پر تلچتے ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہوتی ہے۔ انسانیت کے لئے سب سے بڑی مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب ان بازیگروں کے باطن میں خبیث و شرارت کے عناصر غالب ہوتے ہیں کہ اس وقت صرف وہی خبیث نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ساری رو جس جو ان کے سیاسی پنجوں میں گرفتاری ہوتی ہے۔ سب کی سب گتھی اور ناپاک ہو جاتی ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے قوارے پہا کر انسانوں کی ایک جماعت تیار کی تھی۔ جن کے پاس صاف سچپہ پاک روح متقدرات نفس سلیم قلب، عمیق غلم مستقیم عقل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ ایسی پخت، ٹھوس، مستحکم، غیر متزلزل جماعت تیار ہوئی تھی کہ اس کے بس

یہ توقع بے محل نہ تھی کہ جو نسلیں ان سے نکلیں گی۔ ان میں ان کمالات
 و فضائل کے جو اہر قیامت تک چمکتے رہیں گے۔ کہ یکایک امیر کے گھرانے
 میں وہ بچہ پیدا ہوا جس نے اجسام کو قابو میں لاکر عقولوں پر قبضہ جمایا
 اور بالآخر یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں قلوب و ارواح بھی نبوت کریم
 کے قائل کئے ہوئے مرکز ثقل سے ہٹ نہ جائیں۔ اور اندیشہ کیا کہ
 جب ان میں ابن زیاد و عمر دین سعد شمر پیدا ہو چکے تھے تو کیا اس کے
 بعد بھی ہم اس کو فقط اندیشہ ہی سے تعبیر کرتے رہیں گے! کیا خطرناک
 وقت، کہانی سخت محنت، کہ درخت کی شاخوں کو نہیں بلکہ اس کی جڑوں
 کے ہل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کیا کیا جاتا؟ ایسے وقت میں کیا کیا جاتا
 کیا پزیریدگی گردن اڑا لینے سے پزیرید مر جانا؟ پزیرید مر جانا۔ لیکن اس کی
 روح کس طرح مرنی جس کا وزن امت کے دل و مانع پر پڑھا تھا۔ یہ تھا
 نئی سہانی ہوئی حکمت تھی کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا تھا، ان میں
 سب سے زیادہ ذمی اثر یا اقتدار تھا۔ ان سب سے زیادہ پیارا
 محبوب تھا۔ وہ فاطمہ کے چہرہ سے نکلا۔ اور بجائے پزیرید کے خود اپنے
 ٹکڑے مبارک پر خنجر چلوا دیا۔ سر مبارک تن سے کیا علیہ ہوا کہ مسلمانوں
 کے منہ قلوب۔ ان کی مسحور عقلیں۔ ان کا سویا ہوا دماغ یکایک پزیرید
 کے عقلی اور ذہنی دباؤ سے علیحدہ ہو گیا۔ بظاہر پزیرید زندہ رہا لیکن
 عارفوں نے دیکھا کہ اس کی روح مر گئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا انما
 کی دیوار کو کون سینھالتا؟ حسین نہ سینھالتے تو پھر کس کا زہرہ

تھا کہ اس میدان میں اترتا اور خود اپنے خون سے اس دیوار کی
پٹی ہونی چٹانوں کو پھر مضبوطی کے ساتھ جادیتا۔ حاجی محمد علی
سبح فرماتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے صبرِ کربلا کے بعد

جب یزید کی روح زندہ تھی تو اس سے کوفیوں کی فوج پیدا
ہوئی۔ جب حسین علیہ السلام کو جبارت جاوید ہنشا گیا تو دیکھو اسی کوفہ
سے ابراہیم نخعی، حماد ابو عقیقہ اشعری جیسے اکابر و روحانیین نکلتے چلے
گئے ہیں۔ اور صرف کوفہ کیا، کربلا کے بعد جو بھی آئے۔ اور جہاں بھی
آئے جس شان میں بھی آئے یزید بن کر آئے یا شافعی۔ امام مالک کی
شکل میں نمودار ہوئے۔ یا سنیان ثوری کے لباس میں۔ یہ سب اسی
زندہ روح کی ہمت مردانہ کا بیخود تھا۔

امام کی عظمت کون پایا کر سکتا ہے۔ اس بلند بنیاد پر کون قدم
چا سکتا ہے۔ جس پر حسین علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی ہمہ گیری
ہر و عمر زری کس کے حصہ میں آسکتی ہے، کہ جس کا انتقام دنیا صدیوں
سے لے رہی ہے۔ اور اب تک انتقام پورا نہیں ہوا ہے۔ قسروں
سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے
لیکن تشنگی نہیں بجھتی جس طرح پہلی صدی ہجری میں اس کے اعمال سے
لوگوں نے پیڑاری ظاہر کی، آج تک وہ پیڑاری اسی آن بان کے ساتھ

قائم ہے۔ کتنا گہرا کتنا پختہ رنگ اسے خون حسین علیہ السلام تو نے پیدا کیا۔ فرضی اللہ عنک واصحابک۔ امت مرحومہ یوں تو آپ کے گھرانے کے فیوض و برکات میں از سر تا بہ قدم غرق ہے۔ اور رہیگی۔ لیکن ان احسانوں میں کتنا بڑا احسان ہے۔ جو آپ نے ہم بیکسوں کے ساتھ کیا۔ اگرچہ آپ نبی نہیں ہیں۔ لیکن نبی زادے ہیں۔ اور اسی لئے آپ سے وہ کام بن آیا۔ جو الوالعزم من الرسل کے شایان شان ہے۔ فجر اللہ عناد عن المسلمین خیر الجزائر

آج اسلام کا جہاز پھر اسی گرداب میں آپھنسا ہے۔ پھر مسلمانوں کے اجسام اور اجسام کے بعد عقول، عقول کے ساتھ قلوب غیر اسلامی اثرات کے نیچے دبے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کون یا اثر ہے، اتنا اقتدار کس کو حاصل ہے، جو اپنے سر کو علیحدہ کر کے قلوب کو بھی ان سے علیحدہ کرے؟ اٹھے گا، فاطمہؑ کے گھرانے سے کوئی اٹھے گا۔ رو میں اجنبی دباؤ کے نیچے میں اب زیادہ دیر تک نہ پھڑ پھڑائیں گی۔ قلوب غیروں کے وزن کو اب شاید زیادہ مدت تک نہ محسوس کر سکیں گے۔ عقول کفر کی راہوں میں اپنے لئے روشنی نہ تلاش کریں گی۔ فتر تقبوا انا معکم من المتر بصین!

میں اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو کچھ دل میں ہو۔ کیا زبان یا قلم پر آنا ضروری ہے؟ ہزار نکتہ بار یک ترمو اینجاست۔ بعض

باتیں عام کی جاتی ہیں۔ اور لعضیوں کے لئے صرف اہل کی ضرورت ہے
 نفع اٹھانے والوں کے لئے اس میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ کم
 نہیں۔ واللہ یقول الحق وہو یهدی السبیل۔



اسماء

قامر ملت نواب بہا اور پار جنگ بہا اور
اعلیٰ اللہ مقامہ

شہادت کبریٰ

لسان الامت حضرت قائم ملت علیہ الرحمہ کا وہ خطبہ صدارت جو
 آپ نے بیڑہ صد سالہ یادگار حسینی کے موقع پر اس کے اجلاس سوم کے
 صدر کی حیثیت سے دیا تھا۔

ادبیان عالم میں شریعت
 مجددیہ کو ایک نمایاں اور
حادثہ کربلا کا تاریخی پس منظر
 واضح خصوصیت حاصل ہے۔ انسانی دائرہ فکر و عمل کی وسعت و ترقی
 نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت کو اپنے موقف تک پہنچا
 دیا تھا کہ دین کا صحیح اور حقیقی مفہوم اپنی کامل اور ناقابل تغیر صورت
 میں دنیا پر واضح کر دیا جاتا ہے وہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی ایک جہاں
 ایک طرف ہم کو خالق موجودات سے قریب تر اور وابستہ تر بنانے کا
 آسان ترین ذریعہ نظر آتی ہے۔ وہیں انسانی مدنی و اجتماعی حیات کیلئے
 ایک آخری اور ناقابل تغیر نظام و ضابطہ پیش کرتی ہے۔ اس شریعت

ہیں ہم مذہب کو عیسائیت اور بدھ مت کی طرح اپنے معبود کے ساتھ صرف روحانی تعلق کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں پاتے، بلکہ اس کے ضوابط میں ایک فرد انسانی کے دوسرے فرد انسانی کے ساتھ ایک قبیلہ کے دوسرے قبیلہ کے ساتھ، ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ، ایک ملک کے دوسرے ملک کے ساتھ تعلقات کا مکمل نظام بھی پاتے ہیں۔ اسلام نے اپنے اس اجتماعی نظام کی ابتداء عبادت سے کی، اور انتہائی نظام حکومت پر ہوئی، اسلام کی بنائی ہوئی نمازوں اور اس کے فرض کئے ہوئے روزوں نے جہاں قلب روح انسانی کو مرضات اللہ میں فنا ہونے کا درس دیا وہیں اس کے حج اور اس کی زکوٰۃ کے فرائض میں باری دنیا کے انسانوں کو ایک عالمگیر نظام اجتماعی میں منسلک کر کے ان کی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنانے اور خدا کی خلافت کے نشاۃ ثانیہ کو مکمل کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا گیا ہے۔ غرض ہم اپنے نظام حیات کے کسی گوشہ کو نہ سہی نور ہدایت سے محروم اور تاریک نہیں پاتے۔

اسلام کی تعلیمات کا یہی وہ پہلو ہے جو اسلام کو تمام ادیان عالم میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ لیکن کوتاہ بین نگاہیں اسی مقام پر پہنچ کر ٹھوکریں کھاتی ہیں، اور افضل الانبیاء خیر البشر جنتہ اللعالمین صلوات اللہ علیہم کی جانت مقدسہ پر اس اعتراض کی

جرات کرتی ہیں کہ رنغوز بالذکر کہ حضرت ختمی مرتبت کا مقصد حیات
 اپنے لئے دنیوی حکومت و جہاں کی تلاش تھا۔ جس کے لئے دنیا
 کے اس مقدس ترین بزرگ نے نبوت و رسالت کا ڈھونگ چھپایا
 تھا۔ باسور تھا اسمتھ اور کارلائل جیسے مستشرقین کی نام نہاد اسلام نواز
 تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے والا بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے
 میں ان مستشرقین کو اس لئے قابل معافی تصور کرتا ہوں کہ ان کے
 نزدیک ایسا نیت کے مسلسل مطالعہ کی وجہ سے مذہب کا تصوری غلط
 تھا۔ وہ مذہب میں انسان کی اجتماعی اور مدنی زندگی کے لئے کوئی مقام
 ہی نہیں پاتے تھے اور ان کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص جو لوگوں کے
 رسالت ہاتھ میں رکھتا ہو۔ اور تاج نبوت سے سزاوار ہو۔ اس کو انسانی
 حیات دنیوی کے اجتماعی پہلو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اگر
 تھوڑا غور کرتے۔ تو ان کی سمجھ میں آجاتا کہ اُتردی نجات و صلاح
 کا انحصار تمام ادیان عالم کی تعلیمات میں بالانفاساق دنیوی حیات
 کی کامیابی پر ہے۔ اور تمام مفکرین عالم کے نزدیک انسان فطرتاً
 مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس لئے اس کی دنیوی زندگی کی ہیبت
 اجتماعی کی کامرانی کے بغیر کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لہذا وہ مذہب
 ناکام ناقص اور ترقی یافتہ انسانی جماعت کے لئے
 ناقابل قبول ہوتا۔ جو انفرادی حیات کو تڑپا رہا ہو۔ اور
 اپنے اندر اجتماعی حیات انسانی کے لئے کوئی آئین نہ دکھتا ہو

اگر انھوں نے خاتم النبیین صلی اللہ وسلم کی حیات طیبہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہوتا۔ تو ان کو محسوس ہو جاتا کہ ایک ایسی مستحق جس نے تمام عمر غیروں کی اصلاح میں صرف کر دی، اور قدرت حاصل کرنے کے بعد تعیشات دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھا جس کو اپنے رہنے کے لئے پھولس کے جھونپڑے کے سوا نچھہ مکان۔ بیٹھنے کے لئے کچھور کے پتوں کی کھڑی چٹائی کے نرم لیٹر اور کھانے کے لئے نان شیر کے سوا کوئی اچھی غذا زندگی بھر سیر نہ ہوئی۔ جس نے مالِ غنیمت کے ڈھیر لٹائے ہوں۔ لیکن جس بیویاں اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی ہوں۔ اور جس کی بیٹی اپنے ہاتھ لہاسے آٹا پیستی اور اپنے ٹازک شانوں پر پائی کی مشکیں ڈھوتی ہو۔ اس پر اعتباری حکومت پسندی اور ذلیل دیوبندی جاہ طیبی کا الزام عقل سے محرم اور حقائق سے چشم پوشی کی بدترین مثال ہے۔ نہ میں انکار کر سکتا ہوں۔ اور نہ کسی سے مسلمان کو انکار کی جرات ہو سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکمل نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس نظام حکومت میں دنیا کے فرسودہ نظریات حکومت اور تاریخ کے ملعون و مردود تصورات ناقصیت و برتری کا کوئی مقام نہ تھا۔ محرم عربی کا پیش کردہ نظام حکومت وہ خلافت الہیہ تھی جو نشاۃ آفرینش انسانی ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ میں کا مقصد حیات انسانی میں ایک اجتماعی ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو نشاۃ

خداوندی کے چلانے کے سوا کچھ اور نہ کھتا۔ آئیے ہم اس اسلامی اور محمدی نظام حکومت کا سرسری جائزہ لیں۔ تاکہ محمد کے نواسے کی فدویت اور خانوادہ نبوت کی سرفروشی کا حقیقی راز ہماری سمجھ میں آجائے۔ اور ہم اس یادگاروں کو مناتے ہوئے خود اپنے جاوہر حیات منزلوں کو متعین کر سکیں اور اپنے نثار حیات کے صحیح تصور کے ساتھ اپنی زندگی کو محمد و آل محمد کے غلاموں کی زندگی بنا سکیں۔

مجھے اجازت دیجئے کہ حکومت

حکومت کا اسلامی تصور دیانت کے ان تصورات کو سرسری طور پر تمہیداً آپ کے سامنے پیش کروں جو آجکل ہر ایک متعلم سیاست کی توجہ کامرکز بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ آپ کو ان کے سلمی اسلامی تصور حکومت کا صحیح زاویہ نگاہ سے مطالعہ کر سکیں ظاہر ہے کہ حکومت کے دو نمایاں اور واضح شرائض ہیں۔ ایک اپنے اندرونی نظام کو اپنے منظور کردہ آئین و ضوابط کے مطابق چلانا اور باشندگان مملکت میں امن و ہم آہنگی قائم کرنا اور ان کے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرنا۔ دوسرے اپنی مملکت کو اس طرح مضبوط اور قومی بنانا کہ وہ دوسروں کی دست و بردواستیلار سے محفوظ اور آزادی کے ساتھ اپنے شرائض انجام دے سکے۔ کوئی حکومت اپنے پہلے سبزو کی تکمیل نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے لئے کچھ قوانین و ضوابط نہ رکھتی ہو، اس کے

ہاں ایک ایسی جماعت موجود نہ ہو۔ جو ان ضوابط و آئین کے مطابق حکومت کی مشینری کو چلائے اور نظم و نسق کو برقرار رکھے۔ اور دوسری طرف باشندگان ملک کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کے نزاعات و خصومات کا تصفیہ کرے۔ متغلیہن سیاست انھیں سہ گو نہ لوازمہ ہائے حکومت کی تکمیل کے لئے تین عوامل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ایک ایسی جماعت جس کا کام قانون سازی ہو۔ دوسری وہ جماعت جو ان قوانین کو نافذ کرے۔ تیسرا وہ گروہ جو فصل خصومات اور باشندگان ملک کے تحفظ حقوق کا سرچشمہ انجام دے ان کو ہم اپنی اصطلاح میں مقصدی عدلیہ اور عدلیہ کہتے ہیں۔ آج دنیا کی ساری سیاسی تشکیلات نہیں سہ گروہ اجزائے حکومت کی اصطلاح اور ان کو مختلف النسائی گروہوں کے نشاء کے مطابق چلائے کیلئے ہے۔ انسان نے جو ترقی کی تو اس نے پرشود غلطی یہ سمجھ لیا کہ اپنے نظام اجتماعی کو وہ کسی مافوق الانسان ہدایت و رہبر سے ہی کے بغیر باسانی چلا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس لئے النسائی زندگی کے ہر گوشہ کو النسائی ہدایت کا محتاج قرار دیا۔ اور انسان کے لئے ان اعمال کے فرض و احتیاط کو محفوظ کرتے ہوئے قانون سازی کا شیخ مرتضیٰ خاں سے قدوس کی ذرا بت بزرگ اور بزرگوں کو یقین کیا کہ یہ وہ ہے کہ ہمیں قرآن مجید کو اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں نور افشانا اور جلد و پائشیں کرتے ہیں۔ اصول و ضوابط و قوانین حسیات کی تدوین رب العزیز نے

نے بنفس نفیس قرآن کے ذریعہ کی اور آج ہمارا صرف ایک ہی فرض رہ گیا ہے کہ ان طرف ان کی تفصیل کریں۔ اور دوسری طرف اپنی زندگی کی مٹی گتھیوں کو سلجھولنے کے لئے اپنی اصول کے سخت تفصیلی قواعد مرتب کریں۔

عہد رسالت میں حکومت کی ہیئت پر بھی مرتبہ حضرت نعتی
 جس حکومت کی بنیاد رکھی وہ انہی قوانین الہیہ و ضوابط قرآنیہ پر قائم
 تھی۔ اور اس کی عالمہ و عدلیہ کا فرض ان بزرگ ترین ہستیوں پر عاید
 ہوتا تھا۔ جن کو ملت اسلامیہ ان ضوابط کے سمجھنے اور ان کے جاری کرنے
 کی اہل تصور کرے اور ان کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے اپنے
 آپ کو ان کے مطابق شریعت کے احکام کے تابع بنائے اسلامی
 نظام حکومت میں خلافت رسول یا اجرائے احکام الہیہ کا منصب
 صرف انہیں ذوات قدسیہ کو حاصل ہو سکتا تھا جنہوں نے مشکوٰۃ
 نبوت سے کما حقہ کتابت فرمایا ہو۔ اور علوم قرآنیہ کی بہارت
 نامہ لکھے ہوں۔ صرف معارف اسلامیہ کی واقفیت کسی شخص کو مقررہ
 اطاعت نہیں بنا سکتی تھی۔ جب تک خود اس کی زندگی کا ہر گوشہ علم
 ان احکام اور تعلیمات کا مظہر نہ ہو کوئی ایسا شخص جو قرآن کے استفہام
 نما تقویوں ماکہ تفہیلات کا مخاطب ہو سکے۔ امارت مسیلمین کے
 منصب عالی کا مستحق نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ والبتگان دامن نبوت

کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت، اطاعت و انقیاد کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ جس کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اس کو پھا اور بیکار مسلمان ثابت نہ کر دیا ہو۔ ریاست و حکومت کے وہ تمام تصورات پارہ پیہہ ہو سکتے تھے اور فرعون تھے۔ پاش پاش ہو چکے تھے۔ اسلامی نظام حکومت میں امیر ملت کا وہ خادم تھا جس کو حکومت بلا طلب ملت کی طرف سے عطا ہوتی تھی۔ اور جب حاصل ہو جاتی تو اس کا سر اعزاز و اعجاز میں بلند ہونے کے بجائے ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہر وقت جھکا ہوا جس کو ملت کے خزانہ سے صرف اس قدر حاصل کرنے کا حق تھا جو اس کی قوت لائبرٹی کے لئے کافی ہو۔ اور اس کے مشفقین و جن کی پرورش کا وہ ذمہ دار ہے۔ معیشت کی فکر فرما ہے آزاد کر سکتے۔ نہ اس کے دروازے پر دربان ہوتے تھے۔ نہ اس کے دربار میں نشیب۔ اس کے سر ہانے پتھر کا تکیہ ہوتا۔ اور وہ کھیر کی بوتلوں کے فرش پر سو کر ایرانی قالین کے بہار کا لطف اٹھاتا تھا۔ اس کی ہانکے حکومت ایک گیم پیونڈار ہوتی۔ اور اس کا تاج سرور کی ایک شہساز پارٹیجہ۔ وہ ایوان حکومت میں احکام نافذ کر کے دنیا سے کہہ دیا کہ لڑو ہر اندام کرتا تھا۔ تو اس کا سر نہ اہمیت ایک سب سے بہارا پڑھیا۔ کہ سامنے اشک اور آنسو کے ساتھ جھک جاتا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت سرکشان عالم کی گردوں کو خم کرتی۔ تو اس کے دوستوں کسی بیکس کے گھر کی کڑیاں ڈھو کر کرتے تھے۔ اس کے دربار میں فریب

پڑھیا اور ذلیل غلام کو بھی حرف گیری و نکتہ چینی کا حق ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے فرائض کو کما حقہ ادا کر کے بھی دامن شب کو اپنے پیارے آنسوؤں سے تر کرتا تھا۔ اور خدا کے عذاب سے ڈرتا تھا۔

یہ اسلامی نظام اجتماعی محمد رسول اللہ کا وہ عطیہ اور خدا کی وہ امانت تھی جس کی حفاظت یوں تو محمد کو رسول اللہ سمجھنے والے ہر شخص پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن جن کی نسبتیں محمد سے قریب تر اور مضبوط تر نہیں۔ وہ اس فرض کو عظیم تر سمجھنے پر مجبور تھے۔ دنیا کی تاریخ ہمیشہ اس واقعہ کو افتخار کے ساتھ بیان کرتی رہے گی جس کے نتیجہ کے طور پر محمد رسول اللہ کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زبان حق شناس سے "لولا اظلی لہلک عمر کے الفاظ نکلے۔ اور جبکہ محمد رسول اللہ کے ایک فرض شناس اور نور شہ آئی سے اپنے قلب و روح کو منور رکھنے والے مقرب نے خلیفہ کے وقت کے فیصلہ میں سہو کو برداشت نہ کیا۔ اور بلا اندیشہ و سو اس اس کو ظاہر کر کے ترمیم کروائی۔

زمانہ گزر گیا۔ مالک فتح ہوتے گئے

خلافت راشدہ کے بعد اسلامی تعلیمات کو قبول کرنا والے دنیا کے معلوم کے ایک ایک گوشہ میں پھیلنے گئے۔ یہاں بیت پروردگار و جو بیت سے اسلام کی طرف رجوع کرنا والوں نے اپنے تصورات قدیمہ کو اسلام میں داخل کرنا شروع کیا۔ احکام الہیہ پر مصالح وقت کو

غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ انسانی رائے مذہب میں مقام پیدا کرتی گئی
 خدا چھپنے لگا۔ نفس ابھرتا گیا۔ اور اسلامی تصور حکومت میں رفتہ رفتہ
 قیمریت و کمرائیت کی بو آئے لگی۔ محمد کی جائز نشینی کا معیار اہمیت
 کی بجائے وراثت بننے لگا یہی وہ مقام ہے جہاں روح محمد
 بچپن نظر آئی۔ اور کسی کی رگوں میں خون محمد کھرنے لگا۔ اور اہانت
 محمد کی حفاظت کے لئے آل محمد پر سردار نظر آنے لگے۔

حضرت علی اسد اللہ الغالب کرم اللہ وجہہ
 قلتم وراثت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت اور امام حسن
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت
 سے دست برداری کے بعد خلافت کی نسبت تمام قبیلے چھوڑنے
 اس وقت کے عالم اسلامی کو تہ دیا لاکر رکھا تھا۔ محمد ہو چکے تھے
 حضرت معاویہ نے اسپر پیش روڑوں کے طور پر حکم دیا اس امر پر
 کے نظام کو چلانا شروع کیا۔ گر اس میں ایوان و دہم کی سلطنت حضرت
 دبیوی کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں اسلامی مندرجہ ذیل شہوت
 تھی حضرت معاویہ ان اختلافات سے قطع نظر حضرت عثمان رضی
 اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے
 درمیان پیدا ہو گئے تھے۔ بہر حال منہج یا فتنہ و سبستان پر وقت کے
 اور تعلیمات قرآنی سے کاتب و حق کی تہذیب میں بھی واقفیت رکھتے
 تھے۔ خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ان کی خلافت پر سبب کرنا الزام

اجل امت کے اتفاق کی آخری مہر تھی۔ سارے اصحاب رسول نے ان کی خلافت و امارت کو قبول کیا۔ اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ مجھ جیسے بچہ میرزا کو سزاوار نہیں کہ ایک صحابیؓ رسول پر خروہ گیری کرے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی نظام حکومت میں بنیادی اور اصولی طور پر فتنہ کی بنیاد اس وقت اور صرف اس وقت پڑی جبکہ حضرت معاویہ نے خلافت کو ابوہریرہؓ اور موروثی بنا لیا۔ ان کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ موجود تھا کہ جب وہ اس دنیا سے کوچ کرنے لگے ہیں۔ اور ابولولہ کے پیچھے زخم ان کے آخری لحاظ حیات کو قریب تر کرتے چاہتے ہیں۔ لیکن ملت مر جو مہ کے مستقبل کے تصور نے ان کے سارے جسمانی کرب کو فراموش کر دیا ہے۔ اور جانشین محمد رسول اللہ کا انتخاب ان کے پیش نظر ہے۔ اس وقت کسی نے ان کے سامنے ان کے فرزند عبد اللہ کا نام لیا۔ ان عبد اللہ کا نام جو پدر کے معرکہ اراؤں میں شرکت تھے جو اتباع سنت رسول اللہ میں خود صحابہ کے نزدیک شد تصور کئے جاتے تھے بن کا علم تیرا ان مسلم تھا۔ اور جن کے تقویٰ کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ ان کا نام جیب خانم البین کی خلافت کے لئے پیش ہوا ہے۔ جو حضرت عمرؓ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے۔ اور آپ بستر مرگ پر ٹرپ جاتے ہیں۔ کاش حضرت معاویہ نے اپنی زندگی

میں اصحاب رسول کو جمع کر کے اپنے عہد کے بہترین شخصوں کو تلاش
 کر لیا ہوتا۔ انہوں نے ان کی فراست ایجابی کو لکھنا شروع کیا اور وہی عہد
 کے لئے نیرید کے انتخاب نے اسلامی اصول اجتماع کی بنیاد بنا دی
 کیسے ممکن تھا کہ رسول کا نواسہ اور وارثان تعلیمات نبوی کا استخراج دنیا
 میں موجود تھا۔ اور وہ اس چیز کو پروا نہ کیا۔ دنیا کی حیثیت سے
 وہ بے مہارت تھا۔ انواع یا عساکر اس کے زیر کمان نہ تھے۔ تاج تخت
 پر اس کو اقتدار حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے قلب میں قرآن تھا۔ اس
 کی نگاہوں میں ایمان کا نور تھا۔ اور اس کی زبان پر لا الہ الا اللہ کی تہاد
 تھی۔ اس کا ہر اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ اس کے کٹانے پر قدرت رکھتا
 تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ جان بوجہ کر ایسے شخص کی بیعت نہ کر سکتا
 سکتا تھا جو قرآن اور جاہل قرآن کے قائم کئے ہوئے معیار خلافت
 پر پورا نہ اترتا ہو۔ جس کے ہاتھ میں اگر کوئی انہیں الہیہ اور احکام الہیہ
 کی روح کے بٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کی زندگی خود احکام اسلامی کی
 آئینہ دار نہ ہو۔ جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ امر کا پاسند نہیں اور
 نواہی سے پرہیز نہیں کرتا۔ حضرت امام حسینؑ۔ رضی اللہ عنہم
 کی ساری رحمتیں ان پر نازل ہوں۔ اپنی کسب پوری اور بے مروتی کے
 باوجود اس کو پروا نہ کر سکے۔ اور یہی ان کی شہادت کا پس
 منظر اور تاریخ عالم کے اس عظیم المثل سانحہ کی علت اصلی ہے۔

شہادت کی حقیقت
حق و باطل کی ستیزہ کاری اس

عالم کون و فساد کا قدیم ترین
دشمن رہا ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت تاریخ کے ہر دور میں نمایاں
رہی کہ باطل سارے ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھا ہوا ہے۔
اس کا تخت سیم و زر کے انبار پر قائم ہوا۔ اور ہمیشہ اس
کے جلو میں طاقت و جبروت کی فوجیں ہوتی ہیں اور حق نہ تھا آج بے زور
آیا۔ بے وسیلہ آیا۔ نرزد کے دربار میں آفر کا پستیا ہوا فرعون
کے حضور میں ہی اسکا انیل کا عظیم تم اس خصوصیت کو ہر جگہ
نمایاں پاؤ گے۔ مردان حق کی سب سے بڑی طاقت جس نے دولت
کے اس ڈھیر کو خاک ترے پایہ اور سطوت و جبروت دنیوی کو عین
شقوش بنا دیا۔ وہ ان کی لازوال استقامت اور بے مثال ثبات
تقدم تھا۔ ایسا وقت و احوال حق دنیائے اعتبار کے نزدیک شکست
خور وہ نہ ناکام ہوئے۔ لیکن ان کی ہر شکست میں ایک تھیر اور ان کی
بے ناکامی میں ایک کامیابی مستتر ہی۔ وہ خود مٹ گئے۔ لیکن
عقل و خرد کی دنیا کو بنا گئے۔ وہ خود پاش پاش ہو گئے۔ لیکن اپنے
بعد اصول کا ایک فنانہ ہونے والا نشان چھوڑ گئے۔ دنیا نے جب
کبھی اپنی تعمیر کا مقصد کیا۔ انھیں کے خرابوں پر اپنی سببیاورگی
اور انہیں کے نشان قد کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا ہی وجہ ہے کہ
شہادت نگاہ ظاہر میں کے لئے موت۔ لیکن قلب حقیقت شناس

کے لئے حیاتِ ابدی تصور کی گئی۔ ”وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتٌ بَلْ أحياءٌ وَاكن لا تَشْعُرُونَ“ راہِ حق میں مرنے والے کو شہید اس لئے کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی دنیوی سعی و عمل میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اور فقدانِ اسبابِ دنیوی کے باعث اہلِ باطل سے اپنے آپ کو منوا نہیں سکتا۔ زمانہ کو اپنے لئے ناسازگار پاتا ہے۔ اور اہلِ زمانہ کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتا۔ تو رحمتِ الہی سے بالوس نہ ہونے والا حق پرست امرور کو چھوڑ کر فریاد کی شکل کرنے لگتا ہے۔ اور جب اس کے قدمِ صرور والذکر کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو باطل کی سرحد میں پاؤں رکھنے کی بجائے وہ اپنے خونِ صریح و گرم کی ایک واضح نمایاں اور نہ مٹنے والی لکیرِ حق و باطل کے دورِ راستے پر کھینچ دیتا ہے۔ تاکہ پتے آئیوں اسے رہ نوردانِ حق اس کو دیکھ کر اپنی منزل کا پتہ لگا لیں۔ اور اس کا خون چمکتا ہوا اور باطل کی ننگا ہوں کو خیرہ کرتا ہوا خون، نظریہ آسنے اور محسوس ہونے والا خون قیامت تک باطل سے انکار اور حق کی استیجاب میں شہادت دیتا رہے۔ ان کی یہی شہادت دگو ابی و حیات جاوید ہے جو جریدہ عالم پر ان کے دوام کو ثابت کر دیتی ہے۔ دنیا مٹ جائی ہے لیکن وہ نہیں مٹتے۔

ہرگز نہ مینرواں کہ دلش زندہ شدہ عشق ثبت امرت بر جریدہ عالم دوام ما

اسرار شہادت حسینؑ امام حسین علیہ السلام یزید کے
مقابلہ میں اعتباری فتح حاصل نہ کر سکے
عمر ابن سعد کی فوجوں کو شکست نہ دے سکے۔ شمر باطل پرست کے
شتر کو نہ روک سکے۔ کوفہ اور دمشق کو ان کی فوجوں سے سر ہنسیں
کیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے ہاتھوں کر بلا کے میدان میں لٹا دیا
اپنے جوان اور ہم شیخہ رسول بیٹے کی لاش کو اپنی آنکھوں کے سامنے
پتی ہوئی سر زمین پر ترپتے دیکھا۔ اپنی آغوش میں مسکتے ہوئے
علی اصغر کو دم توڑتے بروا منت کیا۔ اپنے بھائی کی امانت و تاسم
جانباز کو اپنی زبان سے میدان جنگ کی اجازت دیدی تھی۔ اپنی بہن
کو اور زینبؑ جیسی بہن کو اپنی مرضی سے جگر کے ٹکڑوں کا داغ برداشت
کرنے پر مجبور کیا۔ عباس جیسے بھائی کی مفارقت کی پرواہ نہ کی۔ اور سب
سے آخر میں اپنے بیمار بیٹے۔ اپنی نازوں کی پٹی بیوی۔ اپنی ماں حسانی
بہن۔ اپنی عزیز جان بیٹی۔ اور اپنے سارے خاندان کو دشت و کرب و بلا
میں لیے کس و پے سہارا چھوڑ کر رات حق میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔
لیکن جانتے تھے کہ اپنے فرض کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اپنے خون کو اپنے
ناما کی امت کے لئے تلاش حق کی ہر منزل میں نشان راہ بنا رہے ہیں
ان کی یہی ایشیا۔ ان کی یہی قربانی اور ان کی یہی قدو بیت آج دنیا
کے ہر گوشہ میں بسنے والے مسلمان کو ہر سال ان کی یاد منانے
پر مجبور کر رہی ہے۔ امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ اللہ

کی بنیاد والا الہ پر قائم ہے اسلام باطن کی نفی سے شروع ہوتا ہے۔ اور حق کے اثبات پر مکمل ہوتا ہے۔ مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک ان سب اقدار پسندوں کی نفی نہ کرے جو خدا کے سولے اقدار کے بنائے ہوئے ضوابط کے خلاف اپنے اندر اقدار دیکھتا چلتے ہیں۔ مسلمان الا اللہ کے راستے میں مٹ سکتا ہے لیکن لا الہ سے روکا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس یادگار واقعہ میں فی الحقیقت اسلام کی اسی بنیاد می اور اساسی تعلیم کی تلقین پوشیدہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں چھکر کسی کی حقیقت شناس نگاہوں نے دیکھا اور حق پائش نگاہ چلا اٹھی کہ

حقا کہ بنا سے لا الہ است حسین

ابتداء آفرینش سے قانون فطرت ہی رہا ہے کہ خدا کی رحمت نے جب بھی انسان کی تربیت و زوالی کا قصد فرمایا اور اس کو صراط مستقیم دکھانا چاہی۔ تو انہی میں سے اپنے ایسے پسندوں کو منتخب کر لیا۔ جو ان کو اپنے پیام و عمل کے ذریعے خدا سے قریب تر کر سکیں۔ ان مردان حق کا سب سے پہلا کام ہی یہ تھا کہ الا اللہ کا درس دینے سے پہلے انہوں نے لا الہ اللہ کی تلقین کی۔ اور نہ صرف تینہ لا الہ سے سیم و ذرا اور سنگ و آہن کے میدان

مخوس کو توڑا۔ بلکہ تسلوب کی دنیا سے ان بتانِ عنبر
مخوس کی بیخ کنی کی جو حسد اگر بظنورات کی صورت میں جا
گزیں ہو چکے تھے۔ ابراہیم خلیل کے لئے بیت خانہ آذری
مسمار کرنا آسان تھا۔ لیکن قلبِ نمرود کو بدلنا شکلِ اعصاب
موسے ساحر ان مصر کے دہشت انگیز جادو کو تو قمار سکتا
تھا۔ لیکن فرعون سے دعوائے انا دریکھا اعلیٰ کے خبط کو
نہ مٹا سکا۔ ابنِ مریم کے نس و نظر نے ابرص و اعمیٰ کو تو شفا
دی۔ اور مردوں کو تو بحکمِ خدا زندہ کر دیا۔ لیکن اجبارِ یہود اور اکابر
روم کی خدا ناسنامی کو دور کرنا آسان نہ تھا۔ خدا گریزی
و حق و نہ اموشی کے میدانِ جنگ کا راستہ آگ کی چپتا
تکرم موج اور صلیب کی بیخوں سے ہو کر گذرنا تھا۔ یہ اور
ان کے سینے کبھی کامیاب ہوئے۔ اور کبھی نہ ہو سکے۔ لیکن جو
نہ ہوئے۔ انہوں نے اس راستے میں اپنے آپ کو فنا کر کے
اپنے بعد آبنوالے رہ نوردانِ راہِ لالہ کے لئے نقش قدم اور
نشان چھوڑے۔ آج بھی ہم کبھی حج و تشریفانی کے ذریعہ اور
کبھی آیاتِ شراقی کو تلاوت کر کے ان کی تک و تاز جادہ حق
کی یا قازہ کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ اپنی زندگی میں ایسے ہی مواقع
پیدا ہوں۔ تو ان کے طرزِ عمل کو اپنا وظیفہ حیات بناتے ہیں
اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع ہم پر واجب

کی گئی۔ خاتم النبیین محمد الرسول اللہ کی بعثت نے سلسلہ نبوت کو تو ختم کر دیا۔ لیکن نور نبوت سے متنور ہو کر دنیا کی تاریکیوں کو مٹھلی کرنے والوں کا سلسلہ دشت کر بلا سے شروع ہوا۔ اور میدان قیامت تک جاری ہے گا۔ ہمارا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ پشہ چشم کی طرح نور آفتاب سے بے بہرہ رہنے کی بجائے اپنی بصارت کو بصیرت کو اس نور سے متور کریں اور اپنی دنیا کو ان جاں پیاران جاوہ حق کی مقصود و مقہود دنیا بنانے کی کوشش کریں۔

لا الہ الا اللہ کہنے والو! ^{مسئلہ} **حکومت اسلامیہ کیلئے درس عمیق** اور اس پر اپنی حیات و نبوی کی بنیاد رکھنے والو! اور اسی کے ذریعے حیات احتسرووی کی فلاح چاہنے والو! حسین سے محبت کرنے والو! حسین کے لئے رونے والو! اور حسین کی غلامی پر فخر کرنے والو! اگر حسین کی طرح تمہارا مقصد حیات بھی حکومت اسلامیہ کا قیام نہیں ہے تو اگر حسین کی طرح تم اصول حکومت اسلامی کی نسبت ہی دیکھ کر تڑپ نہیں سکتے۔ اگر حسین کی طرح تم بھی سرسبز بیٹے لیکن باطل کی طاقت کے سامنے دست موڑتے ہو تو اسے سے انکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ اگر لا الہ کی منزل تم کو دعوت امین و قرآنی نہیں دے رہی ہے۔ اگر اپنی دنیوی زندگی کا عیش و آرام اپنے آرائش اور مکمل مکان۔ اپنی دولت کے ڈھیسے پر۔

اپنے بیوی بچے اور عزیز و اقارب اپنے مناصب و جاہ و مراتب
 تم کو الا اللہ سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو اپنے جھوٹے دعویٰ محبت
 حسین سے قلب حسین پر خنجر شکر سے تیز تر خنجر نہ چلاؤ۔ اگر تمہاری
 پیشانی زیر خنجر بھی صرف خدا لئے واعد و قہار کے لئے سجدہ
 ریز نہیں ہو سکتی۔ اگر تم راہ حق میں بھی سب کچھ لٹا کر مسکرا نہیں
 سکتے۔ اگر تم ظالم کے گھوڑے کی ٹاپوں میں روندے جا کر بھی سجان
 ربی الاعلیٰ نہیں پکار سکتے۔ اگر تم محمد رسول اللہ کی امانت یعنی
 تعلیمات قرآنی کو دنیا سے ٹٹا ہوا دیکھ کر بھی برداشت کر سکتے
 ہو۔ خدا کا واسطہ محمد رسول اللہ کا واسطہ اور خون شہید کربلا
 کا واسطہ اپنی نسبتوں کو دامن حسین سے وابستہ کر کے اس
 کو آلودہ نہ کرو۔ محرم کا چاند ہر سال افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے
 اور اپنی پستی پستی نازک انگلیوں سے کربلا کے میدان کی طرف اشارہ
 کرتا اور مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے۔ کہ راہ حق میں فدویت اس کی
 زندگی کی منزل ہے۔ یزید و نیاسے سے منٹ نہیں گئے۔ اور کربلا
 کے دامن سے حسین کو چھپا نہیں لیا۔ ہمیشہ یزید پیدا ہونے لگے
 ہیں۔ اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ دنیا کو ہمیشہ حسین کی ضرورت
 رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یزید کو دیکھنے کے لئے حسین کی
 نگاہ و رکارا اور یزید سے نمٹنے کے لئے حسین کا دل چاہیے۔ ہر
 وہ طاقت جو باطل کی علمبردار ہے۔ اور قوانین الہی سے

گریز کرتا چاہتی ہے۔ مزید بیت کی منظر اور ہر وہ مروجی پرست
جو قوائین الہیہ کا لفظ چاہتا ہے۔ اور حکومت الہیہ کا منہمکنی ہے
راہ حسین پر گامزن ہے۔ اگر سپر وہ صد سالہ یادگار کر بلا رہ
نوردان راہ حسین کے لئے کوس رحیل نہ بنی۔ تو اس پر جو محنت جو
روپیہ اور جو وقت صرف ہوا اس کو ضائع شدہ سمجھتا ہوں۔

حیات جاوید کے طلب گزارو

شہادت کی دائمی یادگار فرعون اور اس کے ساتھیوں

کی نسبت قرآن حکیم نے فرمایا کہ فبما بکت علیہم اللہ ما واکلفن

لیکن حسین کی مظلومیت کا دائم آج دنیا کے ہر گوشہ میں ہورہا ہے

اگر چاہتے ہو کہ اپنے آپ کو بھی زندہ جاوید بنالو تو اس کا ایک

اور صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ راہ حسین ہے ہم ہر روز کئی کئی

وقعہ خشوع و خضوع کے اپنے ریسے کے سامنے کھڑے ہو کر صراط

مستقیم کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور پھر اسی کے بتائے ہوئے الفاظ میں

صراط مستقیم کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ ان کی راہ ہے۔ جن پر خدا نے

النسب اقم کیا۔ اور شراعت الفاظ میں اپنے النوام یافتگان کا پتہ

دیتا ہے کہ اور کون ان الذین انعم اللہ علیہم من الذین

والصدیقین و شہداء و الصالحین صراط مستقیم لتہی اللعنت

علیہم کی مثل تک پہنچنے کی تیار کئے جاوے صراط مستقیم تہا کے

رہنے ہے۔ اور وہ شہداء کے کر بلا کی راہ ہے۔ سیرت دلی تمنا

ہے کہ واقعہ کر بلا کی یہ یادگار ہم اے احساس فرض کی بیداری
 کا باعث بنے۔ اور خدا کرے کہ جن دولت کو تباہ ہوتے ہوئے
 دیکھ کر امام حسین نے رشت کر بلا کو اپنے اور اپنے لاڈلوں کے
 خون سے لالہ زار بنا دیا تھا۔ ہم اس دولت کو ایک مرتبہ پھر
 پالیں۔ اور ایک مرتبہ پھر ہم دنیا میں قوانین الہیہ کو نافذ ہوتا اور
 حکومت الہیہ کو قائم ہوتا ہوادیکھ سکیں۔ و خود عوانا ان
 الحمد للہ رب العالمین :-

——————

افزاید

مولانا ابوالکلام آزاد

عقیدہ لیسٹ
پایہ

اعرفوا لله من الشيطان الرجيم
 قال الله تعالى - الحمد لله رب العالمين
 الرحيم الرحيم - مالك يوم الدين اياك
 نعبد و اياك نستعين - اهدنا الصراط
 المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير
 المغضوب عليهم ولا الضالين

✽

شہدایا پروردگار از صدق بنجاک شہدا
 تاول و ویدہ خرتنا بہ فشاہم و اوئدا
 حاوشہ کبرائے اور شہادت اعظمی و قانع و حواوش
 کھنڈ اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے۔ جو تاریخ اسلام
 کی اولین صدق سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب

وغریب تاثر ماتم و درود اور حیتہ انگیز بقائے ذکر و تاشیر کے
 لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث مخزنہ عالم میں ایک
 عظیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آئینوں جمع کئے جائیں جو سلسلہ
 سے لے کر اس وقت تک اس واقعہ جالینوز پر بہائیے گئے ہیں
 اگر وہ تمام وود آہ و فغان سوزاں کو بچا گیا جاسکے۔ جو ان تیرہ
 صدیوں کی لالچہ دار لالچہ دار اسلامی سنتوں کی صدا ہائے ماتم کے
 ساتھ بلند ہوتا رہا ہے۔ اگر درود و کرب کی وہ تمام حقیقتیں۔ اضطراب
 عالم کی وہ تمام پکاریں۔ سوزش و پیش کی وہ تمام بے قراریاں۔ اکھی کی
 جاسکیں۔ جو اس حادثہ کبرائے کی یاد دہن ہزاروں لاکھوں انسانوں
 کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ خون نشا بہا ہے
 حسرت کا ایک نیا اوقیانوس سطح ارضی پر بہہ نہ جاسکے گا؟ وود آہ و فغان
 کی ہزار ہا ٹپٹیاں بجے نہ اٹھیں گی۔ اور ولہ و عالم کی چیخوں۔ حسرت
 کی صداؤں کی تڑپ کی بے چینوں کے ہنگامہ زمین سے تمام عالم
 ایک شور زار زوالہ و بیکانہ بن جائے گا؟

تاہم میں جو پیغام فرزندان اسلام تک پہنچانا چاہتا ہوں
 وہ اس تذکرے سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم عالم کی شدت و
 کثرت کے اعتراف کی تائید نہیں ہوں۔ بلکہ اس عظیم النظیر شدت
 و کثرت کے بعد بھی آنسوؤں کی دلاب ہوں۔ آہوں کی صدا ہوں
 بے قراری کی پکار ہوں۔ اضطراب کی دعوت ہوں۔ اور آہ آہ

لے صدر ہزار آہ و سہراں کہ غم کے لئے بھوکا ہوں۔ اور درد و الم کے لئے یک قلم پیاسا ہوں۔ پس میں آج ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ جو بہت رو چکی ہیں۔ مجھے ان آنکھوں کا سراغ تباؤ جو اب بھی رونے کے لئے تم آلو ہیں۔ میں ان دلوں کی سرگزشت نہیں سنا تا۔ جو تڑپتے تڑپتے ٹھک چکے ہیں۔ میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں۔ جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے مضطرب ہوں۔ مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنبھی ہلے ماضی کا ادعا ہے؟ آہ! میں تو ان زبانوں کے لئے پکار رہا ہوں۔ جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں۔ اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشا طناؤانی کی اس تمام فضا غفلت کو بکدر کر سکتا ہے۔ جس کو عیش و عشرت کے تہہوں میں درود و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں!

نہ داغ تازہ فی قار و نہ زخم کہتہ فی کار و
بدویار ب و سوائے کہیں صورت بجیاں نمی خواہم

ہاں! یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت
دور رسوں نے ماتم کرنے والوں نے ماتم میں کمی نہ
کی۔ آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ سنگامہ ام کی مجلس طرازیوں میں
اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے۔ جتنا آج تک شاید ہی دنیا
کے کسی حادثہ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کرو کہ باا میں ہمہ اس

حادثہ عظیمہ کی دعوتِ اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی دعوتِ درد کے اندر جو حقیقی طلبِ کئی وہ اب تک لپیک کے سچے استقبال سے محروم ہے پیر صدیاں مع اپنے دورانِ محرم و عشرہ ماتم کے اس پر گزر چکی ہیں۔ لیکن اب تک خاکِ کربلا کے وہ ذراتِ خونِ آشام جن کو آج بھی اگر پھوٹا جائے تو خونِ شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں بدستور انوروں کے لئے پکار رہے ہیں۔ خونِ شہادتوں کے لئے داعی ہیں۔ آہ و فغاں کے لئے تشنہ ہیں۔ اضطرابِ دل و ہراس کے لئے بے قرار ہیں۔ اور فضا، ریگ، زار، کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشکِ افشاں جگر ہائے سوختہ دلہائے دو نیم، اور زبان ہائے ماتم سرا کے لئے اسی طرح چشمِ براہ ہے جس طرح سلاخِ ہجر کی ایک آئینِ خیز و پیر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ اختصار اور ظلم و مظلومی جرح و جرحی۔ قتل و مقتولی کے ہنگامہ الیم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فناں فرمائے دعوتِ تھا۔

شیرِ خاک و لپیک، لیکن ہوسے تڑپتا

تواں شہادت کزیں خاکِ مردنی خیز و

لیکن اگر یہ دعوتِ درد و محض اس پانی کے لئے ہے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے ہے۔ اگر یہ طلبِ غم محض ان صد اول کیلئے

ہے۔ جن کا غوغا درختوں کے جھنڈے چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں
 کے سیران کی جگہ انسانوں کی زبانون سے بلبند ہو۔ اگر یہ انتظار
 الم محض اس ماتم کے لئے ہے۔ جو پتھروں کے ٹکرائے کی جگہ انسانی
 دست و سبب کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو۔ تو اسے برا دران غفلت
 شکار یا واسے چشمان خواب آلود بلا شہرہ یہ سب کچھ ہو چکا
 اور بلا شہرہ سوال کو جواب۔ دعوت نیک۔ اور طلب کو مطلوب
 مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا۔ اور روٹی کے لئے آنکھوں
 کو سرخ کر لیا ہے۔ تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں
 آندہ بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈے ہول سے ہل کر چند لٹوں کے لئے
 دنیا کو شور و غوغا سے لبریز کر سکتے ہیں۔ تو آدم کی اولاد اپنی آہ
 و پکار سے کیوں آسمان کو سر پہ نہیں اٹھا سکتی۔؟ اگر بے حبان
 سب سے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ
 پیدا کر سکتا ہے۔ تو تم کہ روح اور ارادہ رکھتے ہو۔ اپنے دست
 ہائے ماتم کماں سے کچھوں ایک ہنگامہ دار و ہشت گرم نہیں
 کر سکتے۔؟ کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روٹی نہیں
 حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا۔؟ کیا تم نے ان زبانوں
 کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے
 ایک پنج بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشہ نہیں دیکھا
 جو تڑپے دبالا ہوتے تھے۔ حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟

پھر کیا اس غفلت آیا ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں۔ جو گو دل
 ہیں۔ مگر دل نہیں ہیں۔ کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے۔ کیا وہ
 کان بھی نہیں ہیں۔ جو گو سامع ہیں۔ مگر کان نہیں ہیں۔ کیونکہ
 نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں۔ جو گو بصیر ہیں۔ مگر
 آنکھیں نہیں ہیں۔ کیونکہ نہیں دیکھتیں۔ لہذا قلوب کا

لِقْفُونَ بَعَارِ لَهْمِ اِذَا نَكَالِ سَمْعُونَ بَعَارِ لَهْمِ
 اَعْيُنَ كَالْبَصِيرَاتِ بَعَارِ - اَوْ كَالْاَنْفِ كَالْاَنْفِ بِلِ هِدَاغِل
 وَاَوْ كَالْاَنْفِ كَالْبَصِيرَاتِ (۱۷۸)

درد و الم کی یہ پاک و عذوق صرف اسس روانی آب و شل
 صدا اور ہنگامہ غوغائی ہی کے لئے نہیں ہوتیں۔ جو آشوب و فساد
 اور آتوں کے لئے نام سے ظہور میں آجائیں۔ اور اگر ان کا بھی مقصد
 ہوتا۔ تو اس کے لئے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے
 ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور کتنے ہی جنگل شور و
 غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔ بلکہ یہ زخوت۔ یہ پکار۔ یہ طلب یہ بل
 من نجیب" فی الحقیقت ان آشوبوں کے لئے ہے۔ جو صرف
 آشوبوں سے نہیں بلکہ دل سے ہوتے ہیں۔ وہ ان آہوں کا وہ حوال
 مانگی سب سے بڑی کی نہیں صرف شہ ہی سے نہیں بلکہ اعراق قلب سے
 اٹھیں۔ وہ صرف آشوب ہی کے نام کے لئے نہیں پکارے۔ بلکہ دل
 کے نام کی محسن ایک ترانہ حقیقت کے لئے ہے۔ اگر تمہارے

پاس اس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اسے کوئی شکایت نہیں
 لیکن آہ تمہاری غفلت۔ اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ
 ہو۔ جس سے پانی کی جگہ خون بہے۔ اگر تمہاری زبانون کو درد کی
 چیخ نہیں آتی۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آہ یہ کیا ہے۔ کہ تمہارے
 دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس۔ عیترت کی ٹیک
 بصیرت کی ایک ٹرپ۔ احساس صحیح و خق کا ایک اضطراب
 بھی نہیں ہے۔

طوفان لوح لانے سے لے چشم فائدہ!

دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء، مظلوم کی مظلومی اور بالحب غفلت
 و نادانی کی پوچھوئی! اس سے بڑھ کر دنیا میں "مظلومی" کی
 مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں۔ دونوں نے
 اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی
 چاہی۔ مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی حقیقت و
 بصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا۔ کیونکہ اس
 کی مظلومی پر انھیں رونا نہ آیا۔ پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا جو
 گورے۔ مگر اس کی اصلی تقدیس و شرف کے لئے سچائی اور عمل
 کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو دشمن تھے۔ اس لئے انھوں
 نے اس کی دعوت حق کو مٹانا چاہا۔ مگر دوست دوست ہو کر بھی

اس کی دعوت کی پیروی نہ کر کے! و تراھد ینظرون

الیک وھم لا یبصرون (۵۶-۵۵)

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوتِ درو کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے تمہاری آنکھیں اس حادثے پر بہت رو چکی ہیں۔ مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے۔ اور اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رلاؤ۔ ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجئے جس میں دل کی اشک نشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔ اناھا لا تعسی الا لبصار و لا کن تعسی

القلوب التي فی الصدور :-

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غرض مطلب یہی ہے کہ اس حادثے عظیمہ پر غور و فکر کی ایک نئی صفت ماتم بچپائیں۔ اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں۔ جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے۔ اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے۔ فذا کران الذکری تنفع المیومین

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ
 یادگار مشاہیر کی حقیقت میں ہمارے سامنے آتی ہے
 وہ اس واقعہ کی یادگار اور اس کا دائمی تذکار ہے

دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے ان واقعات و حوادث
 کی ہمیشہ تعظیم کی ہے۔ جن کے اندر قوم و ملک کے لئے کوئی غیر
 معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی۔ اور ہمیشہ ان انسانی بڑائیوں
 اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی
 روایتوں اور قومی جمعوں کے انعقاد کے ذریعے زندہ رکھنا چاہا ہے
 جس کے اندر جو اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے
 یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام نے متمدن نے "مشاہیر پرستی"
 کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں
 کے بڑے بڑے بانیوں۔ مذہبی معلموں، محب الوطنوں اور قومی
 شہیدوں کی یاد کو بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہم نے الیڈ لکھی۔ کالڈیا کے حجری کتب خانے میں وہ

۱۰ حجری کتب خانے سے مقصود تمدن بابل و کالڈیا کا وہ عہد مدنی ہے
 جب کہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی وجہ سے جگہ پتھر پر کندہ
 کر کے لکھی گئیں۔ اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثار حقیقہ میں موجود

ہے۔ !!

اینٹیٹ رکھی گئی۔ جن پر ناموران ملت کے مناتب محامد کندہ تھے
 عرب جاہلیت نے اپنے سلسلہ والنساب کا ایک حرف ضائع نہ ہونے
 دیا اور ذوالحجہ اور عکاظ میں اسلاف کے کارناموں کی داستان
 سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے بیمار بنائے۔ جو ہزاروں
 برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم و استوار ہیں اور
 پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو "مٹی" کی صورت میں
 محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے ہا بھارت کے مہتر کے کو قومی
 روایتوں میں داخل کر دیا۔ اور الملک کی سحر طرازیوں نے نسلی
 مفاخر کی روح کو پڑھو گی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ منہ نام
 اعمال صرف اسی حقیقت کے لئے کہ اسلاف و شاہیر کی یاد کو
 زندہ و قائم رکھی جائے۔

آج اوقیانوس کا بحری مسافر واشنگٹن کے بہت کو ساحل
 امریکہ پر دیکھ کر دور سے پکارا اکتا ہے۔ یورپ کے بڑے شہروں
 اور ان کی محکوم نوآبادیوں کی شاہراہوں اور باغوں میں جا بجا
 سنگی بہت نصب نظر آتے ہیں۔ شیکاگو کا مولد اب تک قائم ہے
 بلٹن کی پتھر کو مرنے نہیں دیا جاتا۔ جانشین کے آثار اب بھی شخص
 دیکھ سکتا ہے۔ میلان میں ایک جگہ یہ سنگی کتبہ تم پڑھو گے "پاک
 بیڑی سے اپنا بچن گذارا کتھا"
 یہ سب کچھ کئی انسی شاہیر پرستی کی ایک زیادہ نمونہ و تقریب

شکل ہے جو پہلے محض قومی روایتوں اور افسانہ طراز لوگوں کے ذریعہ قائم رکھی جاتی تھی۔

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا یا کسی نام کو فراموشی سے محفوظ رکھنا ہی نہ تھا۔ بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیوں کہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے کسی خاص نام۔ کسی خاص واقعہ کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی۔ پچھلوں کو اگر یاد ہی رکھنا ہے۔ تو اس کے لئے بڑا اور چھوٹا۔ ادنیٰ و اعلیٰ نیک و بد سب یکساں ہیں۔ کون سی وجہ ہے کہ کار کھینچ کے مشہور ہونے والے کو یاد رکھا جائے۔ اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے۔ جو اسی عہد میں گذرا تھا۔؟

سو وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماع انسانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے۔ دراصل ناموں و وجودوں۔ شخصیتوں اور محض تذکرہ و یاد آوری سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ عزائم ہمہ نتائج عظیمہ اور لبھائرو مواعظ جلیبہ ان مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ اور جن کی یاد اور تذکرے کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے۔ اور ان کی یادگار کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ اور مختلف ذریعوں

سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ جن کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمالِ حسنة کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی۔ اور تذکرہ و یاد آوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی۔ بلکہ ان سچائیوں کی تھی جو اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔ خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف اپنی ہی کبریائی کے لئے مخصوص کر لی ہے اور انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ فاطر السموات والارض ہے۔ اللہ "عمل" بڑا ہو سکتا ہے۔ اور اس کی بڑائی سے اس کے حامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آجاتی ہے۔ پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیریں ہر کام کا احترام و شرف جو دنیا میں کیا جا سکتا ہے۔ یا تو خدا کے لئے ہے۔ یا خدا کی سچائی اور اس کے قرار دینے ہونے سے اعمالِ حسنة کے لئے۔ خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین "الحق" کے اللہ لازم کا یہی مطلب ہے اور انا خلقناکم من ذکر وانثروا وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اكرمکم عند اللہ التقائم

۲۹۱ (۱۳۱) سے اسی پر روشنی پڑتی ہے اور یریدون ان لحد و ابہالہ لفیعلوا (۱۸۸۱۳) یہ بد بخت چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف و ثنا ان اعمال کے لئے کی جائے۔ جو انھوں نے نہیں کئے۔ حالانکہ "حمد" کا استحقاق تو اعمال ہی کو رکھتا۔ اسی کی مزید توضیح کرتا ہے۔ وما لعقلها الا العالمون

لیکن دنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایسا وقت اس کی جانب قدم نہ اٹھاتی ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم نے انسان کے نقصان و خسران کے جو مختلف حالات بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنے والی حالت کے لئے "ضالیت" کا لفظ اختیار کیا ہے سورہ فاتحہ میں "مغضوب علیہم" کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسْمِ الرضالین" تذکرہ کیا گیا ہے۔ "ضالیت" کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہم کو معلوم ہے کہ "گمراہی" اور "ناستے میں بھٹک جانے" کے ہیں اسی لئے متیر اور غیر متعین نظر رکھنے والے پر بھی "ضال" کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی متعین راہ اس کے سامنے نہیں

ہوئی۔ پس قرآن کریم نے نوع انسانی کی بد حالی و سبب ہی کی سب سے بڑی عام حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا، اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ لبا اوقات انسان کو اکٹھے اور چلنے سے انکار نہیں ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے۔ پر ہوتا ہے کہ منزل مقصود کی حقیقی شاہراہ اس پر نہیں کھلتی۔ اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزل مقصود سے اسی طرح محروم رہتا ہے۔ جس طرح وہ شقی محروم رہا جس نے چلنے کا مقصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاح قرآنی میں "تخبط اعمال" کی ہے۔ جس پر جا بجا مختلف پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ "تخبطت اعمالہم (۱۸ : ۱۰۲) ان کی تمام محنتیں۔ کوششیں اور راہ روی کی مشقت بالکل اکارت گئی۔ اور اس کا کوئی پھل انھیں نہ ملا۔

چنانچہ اس "عذالت" عمل کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مشاہیر پرستی" بھی ہے۔ جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت اہم عقلمانی مفہمت سیات پرور اور سعادت بخش حقیقت تھی۔ لیکن یوں ہم اس باسے میں ہمیشہ قوموں کے غلطی کی اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھاتی۔ وہ دنیا کی عالمگیر "عذالت" کے لیے جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی۔ اور ظاہر و رسوم کی اس سے پوچھا کرتی ہے۔ اسوں کہ اس حقیقت کے

لئے بھی ہلاکت بخش ہوئی۔ اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس طرح اس عمل عظیم کو آلودہ کر دیا گیا۔ کہ بسا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا ایک بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی۔

انسان کی عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی روح کے لئے اختیار کرتا ہے۔ لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ شاہیر و سلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمالِ حسنہ کی یاد اور نیکی و صداقت کے عملی نمونوں کو پیروی و اتباع کے لئے قائم رکھنا تھا۔ لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی۔ اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لئے واسطہ ذریعہ تھی۔ خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد و اعمال میں جاگزیں ہو گئی۔ اور حقیقت سے اس قدر بعد و نسبتاً دور ہو گیا کہ محض رسوم و اسما کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قائم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہیر پرستی بسا اوقات دنیا میں بہت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد و اسما کی پرستش محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہنچا دیا۔

یہی حقیقتِ اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے

اسوۃ حسنہ اسوۃ حسنہ کے جامع و مانع لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اور یہی مقام ہے۔ جہاں آکر اسلام کی قوت اصلاح اور ختم نبوت کی اصلی علت آشکارا ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام صداقتوں کو لے لیا۔ اور ساتھ ہی کس طرح ان تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا۔ جن کے اختلاط آلودگی سے ان کی روح حقیقت اور تاثیر عمل بالکل فنا ہو گئی تھی۔ ؟

کلا یا متیہ الباطل عن ومن قرآن ایک ایسا معلم و ہادی ہے
 ید یہ وہ من خلقہ تنزیل کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا
 من حکیم عجیب ! ہے اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل
 سکتی ہے۔ وہ عدل و حکیم کا آثار ہوا

(۲۱ - ۲۲)

ہے۔ پھر باطل کا یہاں کیا گذر !

ہاں باطل کیوں کر اب اس کے ساتھ مل سکتا ہے۔ جب کہ وہ "حق فالص" ہے۔ اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملادی گئی تھی۔ اس سے انسان کے ہر اعتقاد و عمل کو بالکل پاک و صاف کر دیا ہے ! نیز جا بجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ وہ انسان کو اس کے سفر اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے۔ اور اسی طرح "شفا" کہا۔ کیونکہ وہ مشکل مفید و نافع ادویہ کے لئے ہے جو مریض کی اصلی قوت طبیعی کو مزید توانائی اور نشوونما دیتی ہے۔ اور مضر اثرات مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں۔ ان کو دور کر دیتی ہیں۔

"اشوہ" کہتے ہیں کسی فکر کسی عمل کسی وعظ کسی قاعدہ کے

ایک ایسے نمونے کو جسے تم اس لئے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے۔ اور اسی کی کسی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کر سکو گے۔

انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منقطع النامیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے۔ وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلا سکتی ہیں۔ مگر اس کے دلوں کو نہیں پھم سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں سیڑیاں ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس کو مجرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکیوں کی بڑی بڑی تعریفیں۔ اور بیروں کی بڑی بڑی براہنیاں تیار کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن کسی برسے انسانوں کو نیکی نہیں بنا سکتے۔

بڑھتا ہے اور ذوق گنہیاں سزا کے بعد

لیکن یہ خلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو۔ اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لئے اسوہ کا حکم رکھتے ہوں۔ تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص کو بلکہ اقوام و ممالک کے اعمال

کو کھیر لپٹ سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آیت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا۔ بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر ان کے حاصل کئے (عملی مشورہ بھی دکھلا دیا۔ وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے۔ اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک و مطہر زندگی ہی۔ اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوس نہ تھی۔ تو بصورت وجود ہی قائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جاسکتی تھی۔ اگر اس کی آیات بنیاد حروف و اصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں۔ تو انبیاء کرام کی زندگی عمل و فعلی کے اظہار اس کی تصویر دکھلا دیتی تھی۔ اگر قانون کہا جاتا کہ اللہ ان کو ایسا کرنا چاہتے۔ تو حیات نبوت مثلاً۔ شکر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا۔ اور اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

یہی حقیقت ہے کہ جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت بیان کیا تھا۔ جبکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال کا حال پوچھا گیا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ان کے خلاف منکر کرنا چاہتا ہے۔ تو قرآن کو دیکھو۔ وہ یہاں حروف و الفاظ ہیں۔ وہاں ایک پیکر مجسم تھا۔ یہاں سب سے وہاں فعل تھا۔ یہاں چران ہے۔ وہاں اس کی روشنی تھی۔

حقیقت ایک ہی ہے۔ جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ "سنت" کتاب کا ایک حقیقی جزو اور مفہوم کتاب میں تبعاً داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر ہیں اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ قرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں۔ تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی پیروی کا مطالبہ ایسا مطالبہ جو "قرآن" کے علاوہ ایک دوسری قوت کا اثبات کرتا ہے جالانکہ "سنت" کی اطاعت "کتاب" کی اطاعت میں داخل ہے۔ اور سنت علم قرآنی کی عملی تفسیر ہے

اور اگر یہ سچ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے خوارج و منکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ میں قرآن ناطق ہوں "تو میں اس کی تصدیق کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں۔ کہ یہ بہت بڑا دعوے تھا۔ یقیناً یہ بڑے سے بڑا دعوے تھا۔ جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ لیکن اگر حضرت امیر نے کیا تھا۔ تو غلط نہ تھا۔ اگر اس کی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوہ حسنہ" کا ایک کامل عکس تھا۔ اور ان کے اعمال کی روشنی سراج نبیر رسالت ہی سے ماخوذ تھی۔ تو کیوں انہیں حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے تئیں "قرآن ناطق" کہیں؟

جو کتاب الہی ما بین الدفتین حروف و نقوش کی شکل میں تھی اس کی ہستی ناطق تھی۔ جو اعمال حضرت مرتضوی کے اندر سے پکارتی تھی۔ خوراج سمجھتے تھے کہ یہ علی ابن ابی طالب کی آواز ہے لیکن ابو ذر اور سلمان کی حقیقت شناسی جانتی تھی۔ کہ یہ علی بن ابی طالب کی آواز نہیں ہے۔ بلکہ "القرآن الحکیم" کی صدائے الہی ہے۔ اور چونکہ "القرآن" کی آواز ہے۔ اس لئے یقیناً خود مثل القرآن کی آواز ہے۔ کنت سمع الذی لیسع بہ ولسانہ الذی تیکلم بہ و بخاری)۔ بہر حال یہ بحث بجائے خود محتاج تفصیل و نظر ہے مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت انسانی کے لئے "تعلیم" کے ساتھ "تورہ" اور "کتاب" کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات کے لئے اس چیز کو اساسی حقیقت قرار دیا۔

لقد جاءكم من الله بلاشبه تمھارے پاس اللہ کی طرف

نور و کتاب مبین سے نور ہدایت آیا۔ اور کتاب الہی جس کی

(۵-۱۴) تعلیم بالکل واضح اور روشن ہے

اس آیتہ کریمہ میں "نور" سے مراد حاصل قرآن و صلی اللہ علیہ

وسلم کا وجود اقدس ہے۔ اور "کتاب مبین" قرآن ہے۔ یہ "نور"

وہی "اسوۃ حسنہ" ہے جو حاصل قرآن کی مستند زندگی میں

"علم" قرآنی کا وجود "عملی" تھا۔

بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول
کی زندگی میں پیروی و اتباع کے لئے
ایک بہترین نمونہ ہے۔

لقد كان لكدني
رسول الله اسوة
حسنه (۲۱-۳۳)

عربی میں "اسوہ" کا لفظ ہر نمونہ کے لئے کہا جاتا ہے۔ اور نمونہ
جس طرح شیر کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شر کا بھی ہو سکتا ہے
اس لئے قرآن حکیم نے "حسنہ" کے لفظ سے اسے متصف کیا
تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل و محاسن ہی کا نمونہ مقصود ہے
اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورہ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملت حنفی
و فطری کے اولین مومس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
متعلق یہی لفظ آیا ہے۔ قد كانت لکما اسوة حسنة فی ابرائیم
والذین معہ

دنیا میں اعمال مقدسہ و حسنہ کی یادگار قائم کرنے کا مقصد
بھی یہی "اسوہ حسنہ" تھا۔ یعنی جن لوگوں کے کسی پاک و اعلیٰ
شہل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے۔ ان کی یاد کو ہمیشہ
باقی رکھا جائے تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی
تازہ ہوتی رہے۔ اور اس کا نمونہ انسانوں کو عظام امور کی طرف
دعوت دے

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسوم
کی اصلی حقیقت لے لی۔ اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اس

سے بالکل الگ کر دیا۔ اس نے یادگاروں کے لئے بت نہیں بنائے جن کو حوادث ارضی کا ایک طمانچہ گرا دے سکتا ہے۔ اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لئے ایک سخت داغ تھا۔ اس نے اینٹ اور چوڑے کی عمارتیں نہیں بنائیں۔ جو طوفان و برق کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لاسکتیں۔ اور جن اثر طواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے سالانہ مجتوں اور قومی تقریروں پر زور نہیں دیا۔ کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ طواہر و رسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اور یادگار کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔ غرض کہ اس نے ان تمام وسائل و تذکار سے یک قلم انکار کر دیا۔ جو عام طور پر تمام قوموں سے رائج تھے۔ اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کی جاسکتی تھی۔ پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لئے ان کے اندر کچھ نہ تھا۔ اور اس لئے ان کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر بنا ہوا تھا۔

اب ہم کو تمام مہیبدوں اور مقدمات
سورہ کریمہ فاتحہ کی مبادیات سے گذر کر اصل موضوع
 کے قریب زیادہ تیز قدمی کے ساتھ آنا چاہیے۔ یاد ہو گا کہ اس
 مقالہ کی ابتداء سورہ مبارکہ فاتحہ سے کی گئی تھی جسے لفظ صبر
 اصل موضوع سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ "السمع المثنائی"
 ہے۔ وہ تمام الکتاب کا متن ہے۔ اور وہ اس کی تمام

تفصیلات کا وجود اجمالی ہے۔ پھر ہدایت انسانی کا کون سا مقام ہے۔ جو قرآن کے احاطہ بیان سے باہر رہ گیا ہو؟
غرض کہ قرآن حکیم نے یادگار دتنگار کے ان تمام رسمی اور ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کر دیا۔ جو عام طور پر دینے اختیار کئے تھے۔ لیکن جب کہ اس نے وہ سب کچھ نہ کیا۔ جو سب کوئی کرتے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے خود کیا کیا؟

اس نے "اسوۃ حسنہ" کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیم کا جزو اعظم بنا لیا۔ اور اس کی یادگاروں کو انسان سے باہر نہیں جن کو انسان چھوڑے سکتا ہے۔ بلکہ خود انسان کے اندر قائم کر دیا۔ جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس نے مادی و جسمانی اعمال و اشکال کے اندر اس کی دعوت عمل و سعادت کو گم نہیں کر دیا۔ جیسا کہ گم کر دی گئی تھی۔ بلکہ اس کو ایک خالص معنوی و روحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کر دیا۔ کہ اس کی حقیقت دائمی طور پر زندہ ہو گئی۔ اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش سے بالکل محفوظ و مصون بنا دی گئی۔

اس نے سب سے پہلے ہیں ایک مقدس "دعا" بتلائی اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی و نیاز کے لئے حاضر ہو۔ تو سب سے پہلے اسی دعا کو پڑھو۔ وہ وقت

ہوگا۔ جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اور اس کی رحمت کا دروازہ باز ہوگا۔ پس ایک عاجز و درماندہ انسان فاطر السموات والارض کے حضور جا کر اپنے لئے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو اس مانگ سکتا ہے۔ وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے۔ اور چاہیے کہ تم اسی نعمت کے سائل۔ اسی مطلوب کے طالب اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

یہ "دعا" سورہ فاتحہ ہے۔ جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے۔ اور وہ نعمت۔ وہ دولت وہ شاع مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے جس کو مانگتے رہتے اور طلب کرتے رہتے کا حکم دیا گیا ہے۔

اهدنا الصراط المستقیم
خدا یا! تو ہیں الصراط المستقیم
پر چلنے کی توفیق دے

یہ الصراط المستقیم کون سی راہ ہے۔ اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی البتہ یہ بتلایا گیا ہے کہ۔

صراط الذین انعمت
ان لوگوں کی راہ جن پر لے پروردگار
علیہم دافحاتم
تو نے انعام کیا۔

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوتی جو انعام یافتہ

لوگوں کی راہ ہے۔ یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں انہی کی راہ عمل الصراط المستقیم ہوگی۔

چنانچہ سورہ نسا میں۔ "الغام یافتہ" جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "انعمت علیہم" میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا۔ اور جن لوگوں نے اللہ اور رسول

ومن یطع اللہ والرسول
فأولئك مع الذين
أنعم اللہ علیہم من
النبین والصدیقین و
الشہداء والصالحین وحسن
اولئک رفیقاً (۲۲-۲۱) جس کسی کو ایسی الغام یافتہ
جماعتوں کی معیت ملی۔ تو کیا اچھی ہے اس کی معیت اور کیا
اچھے ہیں اس کے رفیق۔!

اس آیتہ کریمہ نے صاف صاف بتلایا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جس "الصراط المستقیم" کے تعین کے لئے صرف اس قدر اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ "الغام یافتہ" لوگوں کی راہ ہے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ تیر ان کے مختلف مدارج و مقامات کیا کیا ہیں۔ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اور انہیں "الغام یافتہ" کہا ہے۔ انہی کی راہ عمل و راہ ہدایت و سعادت ہوگی۔ جس کا نام لسان الہی نے

الصراط المستقیم" رکھا ہے۔ اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیہم" اور "الضالین" کی صراط مغضوبیت و ضلالت سے الگ نہیں ہو سکتی۔

سورہ نسا کی اس آیتہ کریمہ سے "الغمت علیہم" کی مزید تفسیر و تشریح کرنا ایک ایسی مسلم اور متفق علیہ تفسیر ہے۔ جسے عہد صحابہ و اہل بیت نبوة در رضوان اللہ علیہم سے لے کر طبقات متاخرہ تک تقریباً تمام ارباب علم و رسوخ نے اختیار کیا ہے۔ اور مفسرین "خاصہ" و "عامہ" سب نے اسے قبول کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں۔ اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبری و صاحب تفسیر مجمع البیان (بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر البیان میں تخریجات حضرات ائمہ کرام علیہ السلام و اقوال مفسرین خاصہ بھی نقل کر دیئے ہیں۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ

پھر حال یہ آیتہ کریمہ بتلانی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورہ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے۔ وہ راہ "العام یافتہ" گروہ کی ہے انعام یافتہ گروہ چار ہیں۔ الامنیہ۔ الصمدیقون۔ الشہداء۔ الصالحون!

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار کے اسلی مقصد کو متتام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کر کے کس طرح قائم کر دیا ہے

اور اس کے لئے کیسی دائم و قائم اور محفوظ و مصون راہ اختیار کی
اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں زہد
پر قائم نہیں کیں۔ لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش
کر دیا۔ اس نے ہر مومن باللہ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی۔ اور
دیا کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ سورہ فاتحہ کیلئے
تجید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے۔ جو اللہ ان اپنے خدا و
کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ "الصراط المستقیم" پر چلنے
التجا ہے تاکہ اس کی راہ سے اسے توفیق ملے۔ اور سعادت کو نیر
حاصل ہو۔ اب اور آگے بڑھو۔ اور دیکھو کہ "الصراط المستقیم" کون
سی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار ہر مومن یاد کرتا۔ اور اپنے
کے حضور جا کر مانگتا ہے۔ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے۔ جن پر اللہ
اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریق حصول یا اس کے عقائد
و اعمال نہیں بتلائے گئے۔ بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی
گئی جنہوں نے ایسے عقائد۔ ایسے اعمال۔ ایسے عزم۔ ایسے ات
کئے تھے۔ جن کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ہوئے۔ اور
چیز یادگار ہے یہی "تذکار" ہے۔ یہی وہ "مشاہیر پرستی" کی اصل
اصلی ہے۔ جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈا مگر نہ پایا۔ وہ کبھی پتھر کے بتوں
کبھی اینٹوں کی عمارتوں کبھی انسانوں کے مجسموں کبھی ملکوں اور قوموں
کی وقتی رسموں اور تقریروں میں بھٹک کر رہ گئی۔ اور صراط الذین اللہ

رعلیم کی جگہ "الضالین" کی صراط پر چلی گئی!

"مشاہیر پرستی" کے زوائد کو چھوڑ دو۔ صرف اس کی اصلی حقیقت اپنے سامنے لاؤ۔ وہ کیا ہے؟ کیا صرف یہی نہیں ہے۔ کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ اور سبکی و صداقت کی راہ پر چلے ہیں۔ ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی یاد ان کے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کر دے اور اس یاد اور حقیقت کی تازگی سے قوموں کے لئے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؛ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورہ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کار فرما ہے۔ سورہ فاتحہ نے انسان کی راہ سعادت و ترقی کے لئے نہ عقائد و افکار بیان کئے۔ اور نہ اعمال و افعال۔ بلکہ ان انسانوں کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتہ الہی تھے۔ یعنی جو انسان راہ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چاہے وہ کسے کہ انعام یافتہ انسانوں کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقائد و اعمال کے نمونے کو بھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عمل ہیئتوں کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار بنا نہیں ہے۔ تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار ہے۔ مگر ایسا تذکار جو اپنے خاصان کے لحاظ سے تمام دنیا میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

پھر ان انعام یافتہ لوگوں کی تشبیح کی کہ وہ اسپارہ ہیں۔

سر لٹین ہیں شہدار ہیں۔ صالحین ہیں۔ پھر ان میں سے ہر گروہ کے

وہ اعمال حسنہ جابجا قرآن حکیم میں مشرح بیان کئے۔ جن سے الصراط
 المستقیمہ کی راہ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی اسی
 غرض اسی "الغنت علیہم" کی تفسیر سمجھو۔ یہ چار گروہ ہیں۔ جن کے اندر نوع
 انسان کا بہترین حصہ آگیا۔ اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر
 ہوگی۔ تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی
 جماعت سے متعلق ہو۔ پس غور کرو کہ تم یادگار، یادگار پکار
 لے ہو۔ تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لئے بیقرار ہے۔ کرہ ارضی
 ہر متمدن انسانی جماعت انسانی بڑائیوں کی یادگار قائم کرنا چاہتا
 ہے۔ لیکن یہ کیسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے جو
 ان کی تمام خرابیوں کو دور کر کے قرآن حکیم نے ہمیں عطا کی ہے۔ وہ
 ان کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو یادگار کا مستحق سمجھتی ہے۔ اور
 زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے۔ بس
 قرآن حکیم نے کرہ ارضی کی تمام حقیقی بڑائیوں اور اعمال صالحہ
 کے تمام گہرائیوں کو چن لیا۔ اور حکم دیا کہ تم ان سب کے نمونوں
 اپنے سامنے رکھو۔ اور سب کے بڑے بڑے کاموں۔ بڑے بڑے
 بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہ ایمان و اسلام کو مرکب و مقوم
 تم یادگار میں بنا کر سال میں ایک مرتبہ انھیں یاد کر سکتے ہو۔ اور
 وسنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال سکتے ہو۔
 سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ لیکن یہ

تیران نے کیسی یاگارتائیم کی جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ
 ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے۔ اور صرف ایک ہی بڑے
 انسان کو ہنسیں بلکہ تمام راست بازار سٹالوں کو جو انبیا صدیقین
 شہداء اور صالحین میں گزرے۔ وہ یاد کرتا اور ان کے اعمال
 ہفتدسمہ کے نمونوں پر چل کر راہ سعادت کی مشعل مقصود
 لے پہنچنا چاہتا ہے۔

تیسرا

(ادبی پریس روٹسمن روڈ کراچی)

دانشان کربلا

حادثہ کربلا پر مشائخ کرام علیہم السلام

منازل اہل قلم کے بصیرت افروز

مقالات کا مجموعہ !

ترجمہ

مؤرخ و محقق مولانا محمد رفیع صاحب

تفسیر الکیلی

پہلا حصہ (تفسیر) - کربلا (پہلا حصہ)

طبع و اشاعت: دار الفکر، کربلا